Acc. No.
212

دامن پہ بھیگی پلکوں کی تحریر چھوڑ کر
وہ شخص جاتے جاتے بھی احسان کر گیا

سفر جاری ھے

337/ROP

صلاح الدین نیّر

Urdu-Poetry

Title:- سفر جاری ہے

(Safar Jaari Hai)

poet:- Salahuddin Nayyar.

Ist edition. 25 DEC 1988.

copies - 1000.

P.P. 356 - P. Rs - 40-00-

Published at - Maktabe Sher-o-Hikmat - 11-6-865 - Red Hills Hyderabad.

Aijaz Printing Press
Chatta Bazar
Hyderabad.

Acc. No:
212

جملہ حقوق بہ حق مصنّف محفوظ

تاریخ و سن اشاعت : ۲۵ دسمبر ۱۹۸۸ء
بارِ اوّل : ایک ہزار
کتابت : غوث محمّد
طباعت : اعجاز پرنٹنگ پریس چھتہ بازار حیدرآباد
قیمت : ۴۰ روپے
ناشر : مکتبۂ شعر و حکمت
۸۶۵-۶-۱۱ ریڈ ہلز حیدرآباد
طباعت سرورق : انتخاب پریس جواہر لعل نہرو روڈ حیدرآباد
ملنے کے پتے : حسامی بک ڈپو۔ مچھلی کمان حیدرآباد
مصنف 11-3-824/7
نیو ملے پلی ۔حیدرآباد-۵۰۰۰۰۱
فون : 228802

صلاح الدین نیّر

اپنی عزیز ترین بہن

شفیعہ قادری

کے نام

جو مجھے بہت عزیز ہے

صلاح الدین نیّر

ترتیب و تزئین

●

بہ شکریہ

جناب غوث محمد صاحب خوشنویس

جناب نور محمد صاحب مالک اعجاز پرنٹنگ پریس

انتخاب پریس جواہر لعل نہرو روڈ حیدرآباد

سفر جاری ہے

"سفر جاری ہے" میں میری زائد از پچیس سالہ شاعرانہ زندگی کے وہ تمام لمحات شامل ہیں، جو میرے احساسات و جذبات کے آئینہ دار ہیں۔ میں اپنے شعری سفر کے ایک ایک پل کی روئیداد قارئین محترم کی نذر کر رہا ہوں۔ ان پچیس برسوں میں ہر تخلیق کار کی طرح میں بھی جذبات و احساسات، مشاہدات و تجربات کے مختلف مرحلوں سے گزرتا رہا ہوں۔

میری شاعری کے خد و خال کو سمجھنے کے لیے یہ مجموعہ میرے میلانات و رجحانات کی رہنمائی کرے گا۔ میری غزلوں میں آپ کو زندگی کی حرارت، صحت مند روایات، کلاسیکی اقدار کی پاسداری، ترقی پسند خیالات اور عصری آگہی کے علاوہ فطرت کی دھوپ چھاؤں، معاشرے کی نرمی و گرمی، داخلی احساسات و قلبی واردات کی تازگی، خواب و بیداری کی باتیں، فکر و خیال کی سچائی، سرِ شام کی سرگوشیاں، آخرِ شب کی گفتگو، چاند کی ٹھنڈک،

سورج کی گرمی، بادِ صبا کے جھونکے اور شبنم کے آنسو ملیں گے رشتوں کی پہچان، محبت، رواداری، وفا، جفا کے نذرانے، پانے اور کھونے کی آرزوئیں، چاہنے اور چاہے جانے کی تمنا، ہنسنے اور رونے کا انداز ان کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ملے گا۔

میں نے زندگی کی رعنائیوں ہی کو اپنایا نہیں بلکہ حالات کی تلخ نوائی کو بھی اپنے شعروں میں سمویا ہے۔ میں نے وہی کہا ہے جو میں نے محسوس کیا ہے۔ میں ایسے ہی ادب کو قابلِ احترام سمجھتا ہوں جو زندگی کی جیتی جاگتی تصویر ہو۔

"سفر جاری ہے" کا انتساب میں اپنی بہت پیاری بھتیجی بہن شفیعہ قادری کے نام کرتے ہوئے دلی مسرت محسوس کرتا ہوں۔ کتاب کی ترتیب و تزئین اگرچہ میں نے خود کی ہے، لیکن بعض صفحات کی ترتیب کے لیے میں اپنی شفیق بہن صالحہ الطاف اور ایک اور بہن کا شکر گزار ہوں۔ کتاب کے سرِ ورق کا ڈزائین میری ایک اور بہن کا نذرانۂ خلوص ہے۔

اظہارِ تشکر کی فہرست میں اور بھی کچھ نام ہیں لیکن ... !

صلاح الدین نیّر
۲۵ دسمبر ۱۹۸۸ء

ہر ایک ذرّہ، بارِ امانت سے ڈر گیا
اِک میں ہی تھا کہ تیرے مقابل ٹھہر گیا

دامن پہ بھیگی پلکوں کی تحریر چھوڑ کر
وہ شخص جاتے جاتے بھی احسان کر گیا

گردش میں اک زمانہ سے کس کی نگاہ ہے
خالی ہوا گلاس تو پیمانہ بھر گیا

تازہ ہوا قریب سے گزری تو تھی مگر
تنکوں کی طرح میرا نشیمن بکھر گیا

تم مسکرا کے اپنا تو دامن بچا گئے
الزام سارا زلفِ پریشاں کے سر گیا

وہ بھی کبھی تھا اپنے قبیلے کا آدمی
کل تیری انجمن سے جو با چشمِ تر گیا

اب تک بھی جس کو چھونے کی بیتر ہے آرزو
وہ لمحۂ عزیز نہ جانے کدھر گیا

دیوانگی شیریں کی محبت میں ملی ہے
یہ کوہ کنی ہم کو وراثت میں ملی ہے

جس نسبتِ دیرینہ کو ڈھونڈا کیا برسوں
وہ بھی تو تری چشمِ مروّت میں ملی ہے

پیراہنِ تازہ میں بھی کیا کچھ نہیں لیکن
خوشبو تری شائستہ روایت میں ملی ہے

کب ہم تھے یہاں پہلے، نظر والوں میں شامل
یہ خوش نظری آپ کی چاہت میں ملی ہے

کس موسمِ تازہ کا ہے تحفہ نہیں معلوم
نرمی تری پھولوں کی نزاکت میں ملی ہے

اک عمر سے میں بھی ترے رشتے میں بندھا ہوں
کیا شے ترے چہرے کی وجاہت میں ملی ہے

اعزاز ہے نیّر! یہ مری بُت شکنی کا
یہ خلعتِ زرّیں بھی خلافت میں ملی ہے

جس کا دنیا میں کہیں بھی نہ ہو ثانی دے دے
جلنے والے! مجھے کچھ ایسی نشانی دے دے

میری اُکتائی ہوئی زیست کو اے دیدۂ تر
اک نیا موڑ، نئی کوئی کہانی دے دے

اب بھی بے موسمِ گُل پھول کھلانے والے
میری سوکھی ہوئی آنکھوں کو بھی پانی دیدے

تھک کے پھر بیٹھ گئی آج زلیخائے وطن
میرے مالک! تو اُسے پھر سے جوانی دیدے

زندگی زخم بنے، زخم سے ناسور بنے
ایسا اک زخم بھی اے دشمنِ جانی دیدے

ہے کئی راتوں کا جاگا ہوا اے بادِ نسیم
وہ جہاں بھی ہو اُسے نیند سُہانی دے دے

اُس کا دامن رہے شاداب ہمیشہ نیّر
میرے اشکوں کو بھی کچھ ایسی روانی دے دے

بے نیازانہ قلندر کی طرح رہتا ہوں
میں جہاں بھی ہوں ہر اک فکر سے بیگانہ ہوں

تجھ کو یہ ناز ہے آواز نئی لایا ہوں
مجھ کو بھی فخر ہے اس دور کا سرمایہ ہوں

میرے اسلاف کی خوشبو ہے مری سانسوں میں
میں بھی اُس سلسلۂ نور کا آئینہ ہوں

جذب جب ہو گئی دروازے پہ دستک میری
تب کہیں جا کے ترے در سے پلٹ آیا ہوں

میں تری بزم تبسم سے بڑی مشکل سے
آبرو دیدۂ پُرنم کی بچا لایا ہوں

زندگی! یوں نہ مجھے چھوڑ کے جا تنہا
اک نظر دیکھ لے میں بھی ترا ہمسایہ ہوں

نمانقا ہوں کی امانت کو میں لے کر نیّر!
اپنی مسند پہ رئیسوں کی طرح بیٹھا ہوں

وقت کے فرعون سے ڈرنا نہیں آتا مجھے
بزدلوں کی موت اب مرنا نہیں آتا مجھے

مجھ سے پڑجاتا ہے شہزادوں کی نیندوں میں خلل
ظلم سہتے سہتے یوں مرنا نہیں آتا مجھے

خوش نظر ہوں اس لیے رہتی ہے میروں پر نظر
پتھروں سے اپنا گھر بھرنا نہیں آتا مجھے

بے سبب جس نے مرے قدموں کی آہٹ چھین لی
پاؤں اُس دہلیز پر دھرنا نہیں آتا مجھے

جس کی مسند چھین گئی ہو اپنے ہی دربار میں
وار ایسے شخص پر کرنا نہیں آتا مجھے

اپنے حصے کی میں روٹی چھین لوں گا ایک دن
گھر میں رہ کر آہیں اب بھرنا نہیں آتا مجھے

میں جیوں گا کس طرح نیّر خودی کو بیچ کر
ظلم سے سمجھوتہ اب کرنا نہیں آتا مجھے

چھوڑ کر اپنا مکان اب میرا گھر دیکھے گا کون
میرے پلکوں کی نمی وقتِ سحر دیکھے گا کون

رفتہ رفتہ عمر کی زنجیر کٹ جانے کے بعد
کس کی بستی میں ہوا ہوں در بدر دیکھے گا کون

پیار تھا جس سے نئے موسم کی مٹی کھا گئی
راستہ میرا یہاں اب عمر بھر دیکھے گا کون

کچھ نہیں ہے میرے دامن میں بجز گردِ سفر
کس دوراہے پر ہے میرا ہمسفر دیکھے گا کون

تم تو چشمِ نم کو ہاتھوں میں چھپا کر لے گئے
میں کھڑا ہوں جس جگہ اُس موڑ پر دیکھے گا کون

جانتا ہوں میں بھی تیرا اپنے رونے کا سبب
کس اذیت میں ہے میری چشمِ تر دیکھے گا کون

مجھ سے نہ تھا اُسے مری غزلوں سے پیار تھا
وہ شخص اجنبی تھا مگر غم گسار تھا

اُس کی ہتھیلیوں میں بھی کانٹوں کے زخم ہیں
جس کے گلے میں کل یہاں پھولوں کا ہار تھا

پتھر کہاں سے آ گئے لوگوں کے ہاتھ میں
موسم بہار کا تو بہت خوشگوار تھا

لوگوں کی سنگ باری سے زخمی ہوا بدن
کچھ اپنے دوستوں کا بھی بھرپور وار تھا

لگتا تھا وہ بھی اپنے قبیلے کا آدمی
وہ شخص غم زدہ تھا مگر باوقار تھا

نظریں ملیں تو اور بھی نزدیک ہو گئے
دل کے معاملے میں کسے اختیار تھا

کرتا تھا کل جو شہر میں پھولوں کا اہتمام
نیرؔ وہی تو قاتلِ فصلِ بہار تھا

پرایا رہ کے بھی اپنا ہے کیا کیا جائے
اُسی سے گھر کا اُجالا ہے کیا کیا جائے

تمہارے دل میں جو پیوست ہے وہی کانٹا
ہمارے دل میں بھی چُبھتا ہے کیا کیا جائے

مجھے عزیز ہے ہر لمحہ اُس کی دل جوئی
وہ سب کو چھوڑ کے آیا ہے کیا کیا جائے

قدم قدم پہ زمانے نے جس کو ٹھکرایا
وہ مجھ کو اپنا سمجھتا ہے کیا کیا جائے

رہیں تشنہ لبی رہ کے بھی میں بہک نہ سکا
کچھ ایسا خود پہ بھروسہ ہے کیا کیا جائے

پناہ ہم نے جسے دی بہ صد خوشی نیّر!
اُسی نے گھر سے نکالا ہے کیا کیا جائے

ہر قدم پر ہے مشکل تازہ
جب سے بکھرا ہے دل کا شیرازہ

آرزو فصلِ گُل کی کون کرے
دل کا ہر زخم ہے ابھی تازہ

صبح روشن خریدنے والو
ہے تمہیں شامِ غم کا اندازہ

ڈوبتے ڈوبتے ستاروں نے
چہرۂ شب پہ مل دیا غازہ

ہم تو صحرا نصیب ہی ٹھہرے
تیرا کیا ہوگا اے گُلِ تازہ

سب تبسم پرست ہیں نیّر
کس کو ہے میرے غم کا اندازہ

متاعِ ہوش یہاں سب نے بیچ ڈالی ہے
تمہارے شہر کی تہذیب ہی نرالی ہے

ہم اہلِ درد ہیں تقسیم ہو نہیں سکتے
ہماری داستاں گلشن میں ڈالی ڈالی ہے

نہ جانے بزم سے کس کو اٹھا دیا تم نے
تمام شہرِ وفا آج خالی خالی ہے

ہم اس سے پہلے یقیناً کہیں ملے ہوں گے
تمہاری بدلی ہوئی شکل دیکھی بھالی ہے

خلوص بانٹتے میں سب کے گھر گیا لیکن
تم آج آئے ہو جب میرا ہاتھ خالی ہے

تعلقات کو ٹوٹے ہوئے زمانہ ہوا
وہ اک نگاہ مگر آج بھی سوالی ہے

کسی کی شمعیں سرِ شام بجھ گئیں نیّرؔ!
کسی کے شہر میں لیکن ابھی دیوالی ہے

اعلیٰ ظرفوں کی جگہ کم ظرف جب پانے لگے
اپنا آنگن چھوڑ کر مرکز سے ٹکرانے لگے

خود فریبی کا ذرا یہ بھی تماشہ دیکھئے
کیسے کیسے لوگ اب اوتار کہلانے لگے

اونچی کرسی کی ہوس میں کچھ نئے خانہ بدوش
خالی شیشوں کی طرح آپس میں ٹکرانے لگے

قومی یک جہتی کے مجرم، قاتلِ امن و اماں
زندگی کا نام لے کر زہر پھیلانے لگے

ایسے ویسوں کے سروں پر تاج کچھ جچتا نہیں
جانے کیسے لوگ ہیں جو خود کو بہلانے لگے

یہ علاقائی تعصب اور یہ فرعونیت
کیا عجب کل ملک کو تقسیم کروانے لگے

جب ہوا تیر یزیدی لشکروں کا سامنا
سر ہمارے اور اونچائی پہ لہرانے لگے

اِس فصلِ گُل کا ایسا ہی اک حادثہ ہوں میں
پھولوں کی پتیوں سے بھی کٹنے لگا ہوں میں

مسند نشیں ہوں آج تو حیرت ہے کس لیے
فرشِ نگاہِ دوست بھی برسوں رہا ہوں میں

بادِ صبا کی طرح جو چھو کر گزر گئی
اب بھی اُسی نگاہ کا اک سلسلہ ہوں میں

بے وجہ وضع داری پہ الزام آگیا
حالانکہ تیرے ساتھ ہی چلتا رہا ہوں میں

خوشبو تمہارے ہاتھوں کی دل میں اُتر گئی
جتنے خطوط پاس تھے لوٹا رہا ہوں میں

کب تک رکھو گے مجھ کو اندھیروں میں دوستو
برسوں تمہارے شہر میں جلتا رہا ہوں میں

آوارگی نصیب میں لکھی تو تھی مگر
نیّر! خود اپنے گھر سے نکالا گیا ہوں میں

ہر رُت میں ایسے لوگ متاعِ چمن رہے
جو اپنے گھر میں رہ کے غریب الوطن رہے

ہر زخم اپنی ذات کا آپس میں بانٹ لیں
ہم میں کم از کم اتنا تو دیوانہ پن رہے

ہم نے لہو دیا ہے نئی روشنی کے نام
ہم بھی تمہاری طرح سے زخمی بدن رہے

خاکِ وطن نے اُن کو گلے سے لگا لیا
جو لوگ قتل ہو کے یہاں بے کفن رہے

اِس طرح کج کلاہی کو اپنی نبھائیے
دشمن سے گفتگو میں بھی اک بانکپن رہے

ہم اپنی وضع داری پہ قائم تو ہیں مگر
کچھ مرحلوں پہ ہم بھی روایت شکن رہے

نیّر! رہو گے جب بھی صلیبوں کے درمیاں
مٹّی وطن کی ہاتھ میں سر پہ کفن رہے

یہ کیسی بزم ہے ہر اِک نگاہ پیاسی ہے
یہاں بھی اپنے ہی گھر کی طرح اداسی ہے

بڑے خلوص سے ہم آ گئے تھے مے خانہ
مگر یہاں بھی وہی مصلحت شناسی ہے

جہاں کہیں بھی اصولوں کا قتل ہوتا رہا
وہاں یہ پھیلی ہوی اب بھی بدحواسی ہے

رفیقِ دل کی طرح کون ساتھ دیتا ہے
لبوں پہ سب کے تو اظہارِ غم شناسی ہے

نظر ملا کے کہاں تم نے ساتھ چھوڑ دیا
وہ بے قرار نگہ آج تک بھی پیاسی ہے

نگاہِ دوست میں کچھ فرق آ گیا شاید
فضائے دیر و حرم کچھ خفا خفا سی ہے

جنوں پسند رفیقوں کو کیا ہوا نیّر!
زمینِ کوچۂ دلدار کب سے پیاسی ہے

کیا شہر تھا کس طرح سے برباد ہوا ہے
قاتل کے سوا شہر میں اب کون بچا ہے

آسودگیٔ تشنہ لبی کس کو ملی ہے
صدیوں سے جو پیاسا ہے وہ پیاسا ہی رہا ہے

کچھ لوگ ابھی قتل کی سازش میں لگے ہیں
حالانکہ صلیبوں پہ مرا نام لکھا ہے

جب آپ کے چہرے پہ کوئی زخم نہیں ہے
کیوں آئینہ ہاتھوں سے مرے چھوٹ رہا ہے

کچھ دن کے لیے جس کو مسیحائی ملی تھی
وہ بھی مرے جینے کا سبب پوچھ رہا ہے

یہ شخص اگر قاتلِ کردار نہیں ہے
کیوں سر کو جھکائے ہوئے خاموش کھڑا ہے

ہم اُس کو وطن دوست ہی سمجھا کیے نیّرؔ!
جلتی ہوئی لاشوں پہ اکیلا جو کھڑا ہے

کھڑا ہوں اب میں جہاں سر پہ سائبان بھی تھا
اِسی مقام پہ میرا کبھی مکان بھی تھا

برادری سے میں کیوں کر اُسے الگ سمجھوں
وہ بے وفا ہی سہی مجھ پہ مہربان بھی تھا

وہ فرشِ گُل سے بھی ہٹ کر کبھی چلا ہوگا
کہ اُس کے پاؤں میں اک زخم کا نشان بھی تھا

یہ حادثہ ہے کہ ملتا ہے اجنبی کی طرح
وہ ایک شخص کبھی میرا میہمان بھی تھا

چھپایا اُس نے جو عجلت سے اپنی پلکوں میں
وہ ایک اشک مرے غم کا ترجمان بھی تھا

ہر اک ادا سے میں اُس کی ہوں اِس لیے واقف
کسی زمانے میں، میں اُس کا میزبان بھی تھا

ملا تو تھا وہ مگر مجھ سے بات کیا کرتا
اُداس ہی نہیں قیصرؔ! وہ بے زبان بھی تھا

نیند اُڑ گئی تو خواب کی تعبیر رہ گئی
وہ جا چکے ہیں میز پہ تصویر رہ گئی

اک نسل میرے سامنے ہے کیا جواب دوں
ٹوٹے ہوئے مکانوں کی تعمیر رہ گئی

سورج کو لے کے ہاتھ میں ہم مطمئن رہے
آگے اندھیرے بڑھ گئے تنویر رہ گئی

جو نقش تھے حیات کے سب مٹ گئے مگر
کتبے پہ اپنے نام کی تحریر رہ گئی

نظریں ملیں جو تم سے تو بس دیکھتا رہا
لیکن تمھاری آنکھوں کی تفسیر رہ گئی

نیّر! ہوا کا جھونکا تھا آ کر چلا گیا
لیکن اُس ایک خوشبو کی تاثیر رہ گئی

لوٹ آنے تک شہر کو بے چین رہو گے
جب میری زمیں چھوڑ کے پرواز کرو گے

بیساکھیاں خود راستہ دکھلائیں گی تم کو
پہلے کی طرح تم یہاں جس روز چلو گے

جو شہر سمجھتا ہے تبسّم کی زباں کو
اُس شہر میں کس کرب میں پھر کس سے کہو گے

ساون کی گھٹائیں بھی گزر جائیں نہ پیاسی
کب آؤ گے کب دل کے مرے زخم بھرو گے

کس گھر کو نہیں ہوتی اُجالوں کی تمنّا
کب تک یوں ہی تنہائی کے عالم میں جلو گے

تم مجھ سے جُدا ہو کے جہاں بھی رہو نیّر!
آنسو کی طرح تم مری آنکھوں میں رہو گے

کیا جانے اب کے رُت یہاں کیا کام کر گئی
چادر نئی بہار کے سر سے اُتر گئی

تم اک لکیر کھینچ کے ہی مطمئن رہے
حدِّ تعینات سے آگے نظر گئی

پھر میری زندگی میں تم آئے تو ہو مگر
میرے لیے وہ پہلی کویتا تو مر گئی

صدمے بہت اٹھائے جدا ہو کے آپ سے
زخمی حیات جیسی بھی کچھ ہو گزر گئی

تم ساتھ تھے تو زیست تھی پھولوں کے درمیاں
جب تم نہیں تھے تو زیست نہ جانے کدھر گئی

کلیوں سے پھول بننے کا جب وقت آ گیا
پہلو بچا کے سب سے نسیم سحر گئی

نیّر مرے خلوص کا یہ بھی ہے حادثہ
اب کے بھی خالی ہاتھ دعائے سحر گئی

مجھ سے مل کر ایک دن جب وہ جدا ہو جائے گا
کون جانے شہر میں اُس روز کیا ہو جائے گا

میری پلکوں پر ٹھہر جائیں گے آنسو آپ کے
جب مری آنکھوں سے اوجھل قافلہ ہو جائے گا

آپ کی دوری سے جب دل کی رگیں کٹ جائیں گی
صبح دم اس شہر میں اک حادثہ ہو جائے گا

گفتگو جاری ہے اُس سے گرچہ بے معنی سہی
چُپ رہوں گا میں تو وہ مجھ سے خفا ہو جائے گا

فاصلے جھکی ہوئی سانسوں کے جب گھٹ جائیں گے
آپ کے قدموں پہ بھی سجدہ روا ہو جائے گا

اس قدر تنہائیاں گر صبح و شب بیٹھی رہیں
ایک دن نیّر بھی تیرا نقشِ پا ہو جائے گا

تم بھی پوچھتے ہو کیوں اداس رہتا ہوں
تمہیں خبر ہے کہ میں مدتوں کا پیاسا ہوں

تمہاری نظروں میں جب گہرے زخم پاتا ہوں
یہ بھول جاتا ہوں میں آج بھی اکیلا ہوں

رہِ وفا میں مسلسل میں چل رہا ہوں مگر
ہو دل میں درد تو کچھ دیر بیٹھ جاتا ہوں

کوئی نہ گزرے مرے بعد تیری راہوں سے
تمام نقشِ کفِ پا سمیٹ لایا ہوں

میں ایک شمع فروزاں ہوں کیوں بجھاتے ہو
تمہیں خبر نہیں کتنوں کا میں اجالا ہوں

بہ مصلحت مرے لب سل گئے تو کیا نیّر
میں تیرے نام سے ہی دل کے زخم بھرتا ہوں

مری رہائی سے پہلے سزا بدل دو گے
گماں یہ کس کو تھا یوں فیصلہ بدل دو گے

اسی لیے ہی تمہیں میں نے بے خبر رکھا
بہار آتے ہی تم میکدہ بدل دو گے

مجھے یقین ہے بے سائباں مکانوں کا
جہاں جہاں بھی رہے تذکرہ بدل دو گے

میں اپنے چہرے کو خود ہی کہیں چھپا لوں گا
تم اپنے ہاتھوں سے جب آئینہ بدل دو گے

تم اپنے دور میں بے خانماں فقیروں کا
کسی بھی گھر سے ملے سلسلہ بدل دو گے

تمہارے نقشِ قدم خود ہی چھوٹ جائیں گے
ہر اک قدم پہ اگر رہنما بدل دو گے

کہاں پھرے گا یہ نیر تلاش کرتے ہوئے
تم ایسے موڑ پہ گر راستہ بدل دو گے

پرایا غم تھا اُسے یا ضمیر ایسی تھی
وہ لڑکی شہرِ غزل میں امیر ایسی تھی

بجز مرے کوئی انجم شناس پڑھ نہ سکا
ہتھیلیوں پہ تمہاری لکیر ایسی تھی

بہت سے تجربے ہوتے رہے رہا نہ ہوئی
نگاہ زلفِ غزل میں اسیر ایسی تھی

تمہارے بعد کسی اور پہ خدا کی قسم
اُٹھی نہ پھر سے نگاہِ فقیر ایسی تھی

ہزار چاہا مرا اک قدم بھی اُٹھ نہ سکا
تمہاری خوشبو مری راہ گیر ایسی تھی

خموشی اُن کی علامت بنی رہی نیّرؔ
ادائے کم سخنی بے نظیر ایسی تھی

آپ کی خاموش آنکھیں جب کبھی نم ہوگئیں
زندگی کی ساری خوشیاں وقفِ ماتم ہوگئیں

داغِ دل جلنے لگے، دل روشنی دینے لگا
جب تری یادوں کی شمعیں اور مدھم ہوگئیں

اپنی محرومی پہ ہم تو آب دیدہ تھے مگر
آپ کی پلکیں نہ جانے کس لیے نم ہوگئیں

انتقاماً ہنس رہے تھے آپ میرے حال پر
ہنستے ہنستے آنکھیں آخر آپ کی نم ہوگئیں

میرے احساسِ شکستِ آرزو کو کیا ہوا
شورشیں کم ہوگئیں، رسوائیاں کم ہوگئیں

زندگی سے پیار کرتا آگیا نیّر مجھے
جب مری آسائشیں گردیدۂ غم ہوگئیں

انجانے پن میں مجھ سے ہوی ہوگی کوئی بھول
پایا تھا اِس قدر نہ کبھی آپ کو ملول

یہ سچ ہے میری دستِ کرم پر نظر نہ تھی
جو کچھ دیا تھا آپ نے میں نے کیا قبول

آنا تھا جن کو آئے بھی آکر چلے گئے
تا عمر اُن کی راہ میں تکتا رہا فضول

کیا جانے کب خزاں کا چمن میں گزر ہوا
شاداب صحنِ گُل سے بھی اُڑنے لگی ہے دھول

اپنی تو کج کلاہی رہی ایک وضع پر
بدلے نہ زندگی کے کہیں بھی مرے اُصول

چھُو کر گئی ہے گرم ہوا اب کے بار بھی
کمھلا گئے ہیں پھر ترے چہرے کے تازہ پھول

جو ناشناسِ غم تھے اجالوں میں آ گئے
نیّر! میں کس کی نذر کروں دشمنی کے پھول

بھیگی بھیگی سی وہی رات کہاں سے لاؤں
اب میں بہتے ہوئے لمحات کہاں سے لاؤں

اب یہی ٹوٹا ہوا دل ہے یہی اشکِ وفا
تیرے لائق کوئی سوغات کہاں سے لاؤں

آپ کہتے ہیں تو ہنس لیتا ہوں کچھ دم کے لیے
اب وہ مہکے ہوئے لمحات کہاں سے لاؤں

میں ہوں دانستہ تری بزم سے وابستہ مگر
خود فریبی کی روایات کہاں سے لاؤں

جب سے تم ہو گئے خاموش رہا میں محتاط
پھر وہ اندازِ ملاقات کہاں سے لاؤں

آج وہ گوشہ بر آواز ہیں نیّر! لیکن
میں سلگتے ہوئے نغمات کہاں سے لاؤں

راہ میں آپ ٹھہرتے ہیں نہ ہم رُکتے ہیں
جب بھی رُکتے ہیں تو منزل کے قدم رُکتے ہیں

جگمگاتے ہیں مری پلکوں پہ یادوں کے چراغ
جب وہ جاتے ہوئے بادیدۂ نم رُکتے ہیں

زینتِ شہرِ نگاراں ہو زلیخا جس جا
صرف اُسی شہر میں یوسف کے قدم رکتے ہیں

اور بھی نم ہوا جاتا ہے کسی کا دامن
جب بھی سائل کے لیے دستِ کرم رکتے ہیں

بزمِ عشرت میں بھلا غم کا مداوا کیسا
کو لنسی راہ میں آسودۂ غم رکتے ہیں

کس دوراہے پہ ہمیں کھینچ کے لائی ہے وفا
سانس رکتی ہے بہ مشکل تو قدم رُکتے ہیں

آج اُس موڑ پہ ہے دردِ محبت تیرا!
زندگانی کے جہاں خود ہی قدم رُکتے ہیں

تمہاری انجمن کی ہر گھڑی سنگین ہوتی ہے
کبھی دل کی کبھی جذبات کی توہین ہوتی ہے

جراحت طنز کیوں کرتی ہے راحت کے قرینوں پر
تمہارے ذکر سے دل کو اگر تسکین ہوتی ہے

یقیں آئے نہ آئے تم کو لیکن واقعہ یہ ہے
نظر جلووں سے مل کر اور بھی رنگین ہوتی ہے

کسی اک اجنبی ہمدرد کی خاموش محفل میں
کسی ٹوٹے ہوئے دل کو بڑی تسکین ہوتی ہے

تمہاری بولتی آنکھیں اگر خاموش ہو جائیں
تو ساری انجمن کی انجمن غمگین ہوتی ہے

بھری محفل میں جب احساس تنہائی ستاتا ہے
تمہاری یاد سے دل کو بڑی تسکین ہوتی ہے

میں ایسی شمع پر آنسو بہا کر کیا کروں نیرؔ!
کہ جس کے نام سے ہی زندگی غمگین ہوتی ہے

اے دوست! کئی بار یہاں ٹوٹ چکا ہوں
تب جا کے ترے شہر میں آئینہ بنا ہوں

ان تازہ اُجالوں کی ہو تقسیم برابر
اِس دن کے لیے میں بھی اندھیروں میں رہا ہوں

کیا بات ہے نظروں کو تشفّی نہیں ہوتی
حالانکہ میں برسوں سے تمہیں دیکھ رہا ہوں

کب میں نے کہا مجھ کو ہے کونین کی خواہش
تھوڑی سی ترے دل میں جگہ ڈھونڈ رہا ہوں

دیکھے تھے کبھی آپ کی آنکھوں میں کچھ آنسو
اُس وقت سے میں آج تلک بھیگ رہا ہوں

یہ سچ ہے کہ کچھ لوگ چٹانوں سے گرے ہیں
میں بھی تو پہاڑوں کی طرح ٹوٹ رہا ہوں

اب زہرِ وفا پی کے بھی خاموش ہوں نیّرؔ!
کیا جانیے کس جرمِ تمنّا کی سزا ہوں

پاک نظروں پہ بھی اندیشۂ رسوائی ہے
جب سے دیکھا ہے تمہیں تہمتِ بینائی ہے

میرے دامن میں تو کانٹوں کے سوا کچھ بھی نہیں
لوگ کہتے ہیں کہ گلشن میں بہار آئی ہے

اِس سے پہلے کبھی میں نے تمہیں دیکھا تو نہیں
پھر بھی لگتا ہے کہ برسوں سے شناسائی ہے

برگِ آوارہ کی مانند ہے تنہا تنہا
زندگی ساتھ مرا چھوڑ کے پچھتائی ہے

وقتِ رخصت ذرا پلکوں کو جھکائے رکھنا
آنکھ مل جائے تو ہم دونوں کی رسوائی ہے

مجرمِ زیست کو مقتل میں دعائیں دینا
غالباً یہ بھی اک اندازِ مسیحائی ہے

نرم آغوش ہو یا بسترِ گُل ہو نیّر!
سونے والوں کو تو کانٹوں پہ بھی نیند آئی ہے

میں سمجھتا ہوں مرے حق میں بہت اچھا ہوا
دل تو ملنا تھا ملا مجھ کو مگر ٹوٹا ہوا

مانگتا ہے آج تیری بھیگی پلکوں سے نمی
چھوڑ آیا ہوں میں اپنا آشیاں جلتا ہوا

کب تلک آخر نہ ابھریں گے ترے نقشِ قدم
اک مسافر کب تلک پھرتا رہے بھٹکا ہوا

آپ کا کیا آپ تو دامن چھڑا کر چل دیئے
میں غریب اپنے رفیقوں میں بہت رسوا ہوا

جانے کیا پیغام لے آئی ہے اب کے فصلِ گل
ہر گلِ تازہ کی آنکھوں میں ہے خون اترا ہوا

منزلِ دار اب بھی روشن، آج بھی رنگین ہے
اب بھی اک دیوانہ ہے زنجیر سے لپٹا ہوا

پھر صلاح الدین نیّر سے غزل سنوایئے
رات ہے بھیگی ہوئی موسم بھی ہے مہکا ہوا

جب کبھی تجھ کو سناتا ہوں کوئی تازہ غزل
لوٹتے ہیں تری پلکوں سے کئی تاج محل

اک تھکے ہارے مسافر کو سکوں مل جاتا
کاش کھل جاتے ترے گیسوئے خم دار کے بل

اپنی صورت بھی نہ پہچانی گئی اتنے لٹے
ہم تو جلتے ہیں سرافراز رہے شہرِ غزل

کوئی موسم بھی ملتے ہیں جو بچھڑے ہوئے لوگ
بھولی بسری ہوئی یادوں کے مہکتے ہیں کنول

دل تڑپتا ہے تو تنہائی میں رو لیتا ہوں
مجھ کو منظور نہیں آپ کی نیندوں میں خلل

غالباً آپ بھی روتے ہی رہے ساری رات
ہائے یہ بکھری ہوئی زلف یہ پھیلا کاجل

بے وفائی کی جہاں رسم چلی ہو نیّر
ایسی محفل سے یہ بہتر ہے کہیں اور ہی چل

سب بہاں سے جائیں گے زخمی بدن رہ جائے گا
شہر میں اک شخص بے گور و کفن رہ جائے گا

فصلِ گل گر بے سبب دستک یونہی دیتی رہے
حرف ایوانوں میں دستورِ چمن رہ جائے گا

دوستو! پوری طرح گردِ سفر اٹھنے تو دو
آنکھ ملتا راستے میں راہزن رہ جائے گا

ظلم کی تاریخ کب بدلے گی کب ٹوٹے حصار
کب تلک ایک اک مجاہدِ بے وطن رہ جائے گا

اہلِ گلشن جب بھی ہوں گے کم لباسی کا شکار
اپنے آنگن ہی میں ہر گل پیرہن رہ جائے گا

تیری محفل سے اگر دیوانے سب اٹھ جائیں گے
کس کے لب پر قصۂ دار و رسن رہ جائے گا

عمر ڈھل جائے تو کیا نیّر! مزاجِ دوست میں
کج ادائی کم تو ہوگی، بانکپن رہ جائے گا

اب کے برس جب آئیں تو اِس طرح آیئے
میری زمیں پہ اپنا بھی اک گھر بنایئے

کافی ہے اِتنا آپ کی پہچان کے لیے
بننے سے پہلے آئینہ خود ٹوٹ جایئے

کب سے ہیں انتظار کی بانہیں کھُلی ہوئی
بن باس ختم ہوتے ہی گھر لوٹ جایئے

خوشبو حنائی ہاتھوں کی پھر یاد آگئی
کچھ اور خوشبو اب کے برس ساتھ لایئے

تاعمر خود شناسی کا اعزاز کم نہ ہو
کچھ اتنا اپنے آپ سے نزدیک آیئے

تازہ رہے ہمیشہ محبت کا احترام
اس طرح اپنے رشتوں کو نیّر سنبھالیئے

شہر کو چھوڑ کے ہی تم کو اگر جانا تھا
میری آنکھوں میں نہ اِس طرح اتر جانا تھا

گفتگو گردشِ دوراں سے ابھی جاری ہے
اور کچھ دیر مرے پاس ٹھہر جانا تھا

ٹوٹ کر آخری آنسو کی طرح پلکوں سے
مجھ کو بھی آپ کے دامن پہ بکھر جانا تھا

زندگی بھر کبھی دیدار کی حسرت نہ رہے
آخری بار کچھ اِس طرح سنور جانا تھا

میرے آنگن میں نئے پھول کی خوشبو لے کر
تم نسیمِ سحری بن کے بکھر جانا تھا

بے سبب شہر سے کیوں دُور نکل آئے ہو
اِک نہ اِک دن تمہیں جب لوٹ کے گھر جانا تھا

اِس سے پہلے کہ ملے بھیک کرم کی تیرؔ!
اپنی دہلیز پہ سر پھوڑ کے مر جانا تھا

ہمارے سامنے قاتل ہے کیا کیا جائے
وہ اب بھی زینتِ محفل ہے کیا کیا جائے

فریبِ جلوہ گری سے جھلس گئیں آنکھیں
یہ اختیار اُسے حاصل ہے کیا کیا جائے

تمام شہر ہے پیاسا دُھواں دُھواں منظر
یزید اپنے مقابل ہے کیا کیا جائے

یہ غم نہیں ہے کہ رہزن سے گفتگو نہ ہوی
نظر میں صاحبِ منزل ہے کیا کیا جائے

ہر ایک لمحہ میں برسوں کا ہے سفر جاری
ہوا کے دوش پہ محمل ہے کیا کیا جائے

تمام عمر دیا جس کو میں نے درسِ جنوں
وہ آج میرے مقابل ہے کیا کیا جائے

بہت سے ڈوبنے والے تو بچ گئے تیزؔ!
ہمارا گھر لبِ ساحل ہے کیا کیا جائے

گلاب جیسا بدن اور یہ سیاہ لباس
مری نگاہوں کی بڑھنے لگی ہے اور بھی پیاس

جو اپنے ہونٹوں پہ اوروں کی پیاس لے کے پھرے
کہاں سے لاؤ گے تم آج ایسا قدر شناس

تمھیں پتہ نہیں کاجل لگی اِن آنکھوں میں
ٹھہر گئی ہے مری آ کے ایک عمر کی پیاس

ہمیں تو خانہ بدوشوں میں بھی جگہ نہ ملی
تمہارے قُرب کے لمحے نہ آئے ہم کو راس

نظر تھی تیز تو بینائی چھن گئی میری
جو تُو نہیں، تری پرچھائیاں ہیں میرے پاس

میں اپنے عیب و ہُنر خود ہی دیکھ لیتا ہوں
تری نظر کے سوا اور کیا ہے میرے پاس

وہ صبح بن کے کسی دن تو آئے گا نیّر!
کسی کی یادیں کب تک رہو گے یونہی اُداس

کچھ اور روز مجھے تیرے پاس رہنا ہے
پھر اس کے بعد ہمیشہ اُداس رہنا ہے

دل و نظر میں تمہارے ہزار زخم، سہی
تمھیں بھی میری طرح خوش لباس رہنا ہے

نہ جانے کس کو یہاں کون چھین لے جائے
اِسی لیے تو ترے آس پاس رہنا ہے

ہماری برسوں کی پہچان کھو نہ جائے کہیں
نظر میں اپنی ہمیں خود شناس رہنا ہے

کبھی تو آپ کی آنکھوں میں آئیں گے آنسو
اِس انتظار میں خالی گلاس رہنا ہے

ہر ایک لمحے کو نیتر! سمیٹنے کے لیے
نگاہِ دوست میں با التماس رہنا ہے

آئینہ مرے ہاتھ سے خود چھوٹ رہا تھا
جب پہلے پہل آپ کو محسوس کیا تھا

آیا تھا جو گمنام جزیروں سے نکل کر
وہ مجھ سے نئی رُت میں کئی بار ملا تھا

کب اپنے قبیلے سے الگ تھا وہ اک آنسو
وہ ٹوٹ کے بھی آپ کے دامن میں گرا تھا

اتنا ہے بس اب یاد کہ دو ہاتھ ملے تھے
کیا میں نے لیا تھا، مجھے کیا تم نے دیا تھا

چھوتے ہوئے قدموں کو بہ اندازِ عقیدت
کیا آپ سے رشتہ ہے مرا بھول گیا تھا

کیا بات تھی کیا جانیئے نیّر! مری جانب
وہ دور تھا نظروں سے، مگر دیکھ رہا تھا

جب کوئی دامن نہیں تھا چشمِ پُرنم کے لیے
تب میں آیا تھا تمہارے خیر مقدم کے لیے

جتنے آنسو تھے بہا آئے ہیں تیرے شہر میں
ہائے اب کچھ بھی نہیں ہے صبحِ ماتم کے لیے

اس عنایت کے سوا کچھ بھی نہیں چاہونگا میں
آپ کی دوری سلامت! مستقل غم کے لیے

یا الٰہی! شہر میں تھے اور بھی خانہ خراب
میرا دل ہی رہ گیا کیوں دردِ پیہم کے لیے

کب تلک یہ سنگباری آئینوں کے شہر میں
ہم نمونہ تھے کبھی تہذیبِ عالم کے لیے

آسماں سے نور بھی برسے تو نیّر کیا کروں
اُن کی تصویریں بہت ہیں میرے البم کے لیے

منہ پھیر لیا روٹھ کے آئینہ گری نے
سمجھوتہ کیا آپ سے جب خوش نظری نے

وہ جس نے ہمیں دی تھی اُجالوں کی بشارت
وہ چہرہ دکھایا ہی نہیں دیدہ وری نے

آئے نہ نظر دستِ کرم چومنے والے
جب غور سے دیکھا یہاں دریوزہ گری نے

کیا جانیئے کتنوں کا بھرم کھول دیا ہے
دروازے پہ دستک کی طرح بے خبری نے

ہم جیسے فقیروں کے ہوئے ہاتھ بھی خالی
جب کاسۂ غم چھین لیا دربدری نے

برسوں کی مسافت ہوئی جب طے تو بنایا
شائستہ نظر مجھ کو تری ہم سفری نے

اُس سے نہ ہوئی کھُل کے کبھی گفتگو تیرؔ!
ہم کو تو کہیں کا رکھا معتبری نے

کل رات تیری بزم میں دیوانہ جل گیا
اپنے ہی دل کی آگ سے پروانہ جل گیا

اعجازِ مے ہے یا مرا احساسِ تشنگی
ساقی کا ہاتھ لگتے ہی پیمانہ جل گیا

فرزانگیٔ حسنِ مجسم سے کیا گلہ
خود سوزِ عشق سے دلِ دیوانہ جل گیا

ساقی کی اس میں کوئی بھی سازش نہیں مگر
رندوں کی آہِ سرد سے میخانہ جل گیا

نم دیدہ رات کی گھنی پلکوں سے پوچھئے
کس بے بسی سے شمع پہ پروانہ جل گیا

نیّر! وفا کی آگ میں کل شب کی بات ہے
فرزانہ سوچتا رہا، دیوانہ جل گیا

چاہتا ہوں کہ جی بھر کے باتیں کروں عمر بھر آپ کا ساتھ ہو یا نہ ہو
کون جانے کہ کل پھر مرے ہات میں آپ کا پھول سا ہات ہو یا نہ ہو

میں سمجھتا ہوں یہ آخری رات ہے آپ کے نرم لب پر مری بات ہے
آج جو کچھ بھی کہنا ہو کہہ دیجئے پھر خدا جانے یہ رات ہو یا نہ ہو

لے الگ ہے مگر ایک ہی ساز ہے تیری آواز میں میری آواز ہے
پھر بھی ڈرتا ہوں اے محورِ آرزو! آخری سانس تک ساتھ ہو یا نہ ہو

ایک خاموش اظہارِ غم کے سوا کوئی عنواں نہیں آج کی رات کا
آخری بار کرنا ہے عہدِ وفا پھر دوبارہ ملاقات ہو یا نہ ہو

شمعِ محفل کی لو تھرتھرانے لگی، چاند تاروں کی بارات جانے لگی
یہ وداعی ملاقات ہے ٹھہرئیے کیا خبر پھر ملاقات ہو یا نہ ہو

نیّر جاں بہ لب سے یہ نامِ غزل، ایک مجروح نغمہ سمجھ کر سہی
چوٹ کھایا ہوا گیت سن لیجئے پھر یہ نغمات کی رات ہو یا نہ ہو

قافلہ تہذیب کا لٹتا ہے تیرے شہر میں
یہ تماشا رات دن دیکھا ہے تیرے شہر میں

آج بھی حسبِ روایت سنگ باری چاہیئے
ایک دیوانہ ابھی پھرتا ہے تیرے شہر میں

آرزوئے تسکینِ دل کی اک اذیت بن گئی
میرے ماضی کے سوا اب کیا ہے تیرے شہر میں

لب پہ ہلکا سا تبسم، دل سے اٹھتا ہے دھواں
اک چراغ ایسا بھی اب جلتا ہے تیرے شہر میں

میری شائستہ مزاجی کے سوا سب کچھ لٹا
جتنا پایا تھا وہ سب کھویا ہے تیرے شہر میں

آنسوؤں کی پھول مالا کس کو پہنائیں گے ہم
اک ہجومِ مہ وشاں رہتا ہے تیرے شہر میں

جنگلوں کی خاک چھانی رات نیّر نے مگر
صبح دم کچھ سوچ کر آیا ہے تیرے شہر میں

دل گیسوئے جاناں میں گرفتار کہاں ہے
سرشار تو ہے اتنا بھی سرشار کہاں ہے

آواز دو پھر طرزِ زلیخا نظری کو
یوسف تو ہے موجود خریدار کہاں ہے

یہ لوگ تری بزم میں آج آئے ہیں ساقی
ہر روز جو آتا تھا وہ مے خوار کہاں ہے

اے جانِ تمنّا، ترا حامی ہے زمانہ
میں سوچ میں ہوں میرا طرفدار کہاں ہے

اپنے سے پشیمان ہے خود ذوقِ نظارہ
ہیں بزم میں سب، حاصلِ دیدار کہاں ہے

اے دوست، تبسّم کی تمنّا تو ہے آساں
بھیگے ہوئے دامن کا طلبگار کہاں ہے

ہے وقتِ وداع آج ہی کچھ سوچ لے ورنہ
نیّر سا ترے شہر میں غمخوار کہاں ہے

لڑکھڑانے والے جب خود سنبھل کے چھپائے
ہم بھی دو قدم اُن کے ساتھ چل کے چھپائے

پھر وہی دھندلکا تھا پھر وہی اداسی تھی
صبح دم کئی غنچے آنکھ مل کے چھپائے

دشت دشت پھرتے ہیں قافلے بگولوں کے
گیسوؤں کے سائے سے ہم نکل کے چھپائے

ذوقِ جستجو سے تھی عظمتِ سفر قائم
ہائے ہم سوئے منزل تیز چل کے چھپائے

آج تک سلگتے ہیں دامنِ وفا اُن کے
گرمیٔ محبت سے جو پگھل کے چھپائے

تیرگی کا غم کیا تھا، پھر بھی اُن کی محفل میں
رات رات بھر نیّر ہم بھی جل کے چھپائے

پہلے کی طرح شام و سحر کون آئے گا
مجھ جیسے غم نصیب کے گھر کون آئے گا

دیوانگی ہے سرحدِ ادراک سے پرے
اب آگہی کے زیرِ اثر کون آئے گا

ٹوٹے ہوئے بدن کی طرح نذر کے لیے
ہاتھوں میں لے کے دیدۂ تر کون آئے گا

اِس سوچ میں جو عمر تھی باقی وہ کٹ گئی
بن کر یہاں نگارِ سحر کون آئے گا

رو رو کے ساری رات اِسی فکر میں کٹی
بیمارِ غم کی لینے خبر کون آئے گا

سب تازہ گُل فضاؤں میں تحلیل ہو گئے
اب ہر روش پہ ہم کو نظر کون آئے گا

مدّت کے بعد گر تمھیں بینائی مل گئی
نیّرؔ! بجز تمہارے نظر کون آئے گا

جب بھی کسی فرزانے کو دیوانہ لکھوں گا
ہر بات بہ انداز رئیسانہ لکھوں گا

ہر سانس کو گھلائے گی جب گرمیٔ حالات
بھیگی ہوئی پلکوں سے میں افسانہ لکھوں گا

شاداب ہے دل پچھلی ملاقات سے اب تک
جب آپ کہیں دل کو میں ویرانہ لکھوں گا

اک نسبتِ دیرینہ ہے میخانہ سے مجھ کو
کم کم جو کھلیں آنکھیں تو پیمانہ لکھوں گا

جو زخم ہے دامانِ نسیمِ سحری پر
اُس زخم کو میں سب سے جدا گانہ لکھوں گا

پہلے تو مجھے آپ ہی سنگسار کریں گے
جس وقت بھی میں شمع کو پروانہ لکھوں گا

بکھرے ہوئے رشتوں کو سمٹ جانے دو نیرّ
کس شخص سے ہے آپ کا یارانہ لکھوں گا

فصیلِ شہر کو جب تک گرا نہیں دیں گے
ہمیں یہ لوگ کبھی راستہ نہیں دیں گے

کہیں بھی بیٹھ اگر تجھ سے چھن گئی مسند
تجھے ہم اپنا کبھی بوریہ نہیں دیں گے

تمام عمر جو چہرے کو اپنے پڑھ نہ سکا
ہم اُس کے ہاتھوں میں اب آئینہ نہیں دیں گے

گھٹن ہو ایسی کہ تم پوری سانس لے نہ سکو
تمہیں ہم اِس سے زیادہ سزا نہیں دیں گے

ہمیں گوارا ہے دشمن کی پیش قدمی مگر
امیرِ شہر کو ہم راستہ نہیں دیں گے

یہ بزمِ شعر و ادب کب کسی کی ہے میراث
جو نسل گونگی ہو ہم جائزہ نہیں دیں گے

وہ جن کے نام سے ہم زہر پی گئے نیّر!
ہم اُن کے حق میں کبھی بد دعا نہیں دیں گے

شکل بدلی کہاں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کی
منتشر ہو کے بھی یہ جان ہیں مے خانوں کی

خوش نگاہی پہ بھروسہ ہے تو ملتے رہیئے
میری آنکھوں میں ہے تصویر صنم خانوں کی

کسی گوشے میں بھی ساقی نظر آیا نہ ہمیں
صرف آواز ہی سنتے رہے پیمانوں کی

مے کی تقسیم میں اب ذہنی تحفظ نہ رہے
ورنہ تاریخ بدل جائے گی میخانوں کی

جو بھی آتا ہے یہاں لوٹ کے جاتا ہی نہیں
کونسے شہر کی مٹی ہے صنم خانوں کی

ختم ہوتا نہیں نیّر! کبھی خوشبو کا سفر
عمر بڑھتی ہی چلی جاتی ہے دیوانوں کی

نہ ڈگمگائیں کہیں آپ کی جفا کے قدم
میں کر رہا ہوں حدیثِ وفا سپردِ قلم

تمام عمر کی محرومیوں نے کیوں آخر
مری حیات کے زخموں پہ رکھ دیا مرہم

ہزاروں قافلے اب تک گزر گئے لیکن
چمک رہے ہیں ابھی تک کسی کے نقشِ قدم

کبھی تو اپنے بھی دامن کا جائزہ لے لو
تمہیں خبر نہیں کب سے ہماری آنکھ ہے نم

حیاتِ سادہ کو دانستہ اب نہ اُلجھاؤ
یہی بہت ہے سلیقے سے جی رہے ہیں ہم

اُداس اُداس سی لگتی ہے شہرِ گُل کی فضا
یہ کس غریب کا ہے آج شہر میں ماتم

کیا ضروری ہے کہ شعلوں کو ہوا دی جائے
کیوں نہ اِس شہر سے یہ رسم اٹھا دی جائے

ہم کو جینا ہے یہاں خون کے رشتوں کی طرح
فاصلے ہوں تو یہ دیوار گرا دی جائے

زندگی آ ذرا نزدیک تجھے دیکھ تو لوں
سوچتا ہوں کہ تری عمر بڑھا دی جائے

جُرم ثابت ہو تو سولی پہ چڑھا دو مجھ کو
کیوں مرے جُرم کی اوروں کو سزا دی جائے

اُتنا ہی پاؤں سے زنجیر کا رشتہ ہوگا
جس قدر قید کی معیاد بڑھا دی جائے

کون قاتل ہے یہاں اپنے رفیقوں کے سوا
سب بھلے لوگ ہیں کس کس کو سزا دی جائے

جس کی پرچھائیں سے آپس میں ہو نفرت پیدا
ایسی تصویر نگاہوں سے ہٹا دی جائے

مجھ کو ہے اب بھی آپ سے ملنے کی آرزو
ڈر ہے نہ بدلے آپ کا اندازِ گفتگو

آنسو کبھی کے ہو چکے نذرِ شبِ الم
اب چشمِ منتظر سے ٹپکنے لگا لہو

آنکھیں بجھی بجھی سی ہیں چہرہ اداس ہے
اللہ رکھ لے آج شبِ غم کی آبرو

کیا کیا نہ سوچ رکھا تھا کچھ بھی نہ کہہ سکا
کیا بات تھی کہ لب نہ ہلے اُن کے روبرو

صبحِ طرب سے اور بھی محرومیاں بڑھیں
تا عمر کاش رہتی شبِ غم کی جستجو

نیرؔ! ملیں گے یوں تو کئی دردآشنا
ایسا نہیں کوئی جو کرے چاکِ دل رفو

پھر نئی رسم حلف سے یہ شروعات ہوئی
شہر میں پھر نئے قاتل سے ملاقات ہوئی

میرے ہاتھوں سے قلم چھین کے اعزاز نہ دو
ایسی بخشش بھی تو اک طرح کی خیرات ہوئی

شہر کی آبرو ہم سب کی امانت تھی مگر
بچ کے جب نکلی تو پھر نذرِ فسادات ہوئی

آپ سے پہلے اندھیروں میں بھی رعنائی تھی
آپ آئے تو یہاں اور سیہ رات ہوئی

سب کے ہاتھوں میں رہیں گے یہاں پانی کے گلاس
حاکمِ شہر کو گر اگلے برس بات ہوئی

کونسی سمت سے آئے گا رہائی کا پیام
زندگی جتنی تھی سب صرفِ مناجات ہوئی

تشنگی عام ہے کس کس سے لڑو گے نیّرؔ!
مے کی تقسیم کہاں حسبِ روایات ہوئی

یہ زندگی میری یوں ہی برسوں رہی پیاسی
تب مجھ میں سمٹ آئی ہے کچھ درد شناسی

کیا جانئے کب شیشۂ دل ٹوٹ کے بکھرے
اب تک بھی اِن آنکھوں میں ہے کچھ ایسی اُداسی

یہ حادثہ پھر بھی نئی کلیوں کے لیے ہے
گُلدستے کی زینت جو بنے پھول تھے باسی

کم پیرہنی ٹھہرے گی جب حرفِ ملامت
یاد آئے گی تب آپ کی شائستہ لباسی

اُلجھے ہوئے حالات پہ قابو نہیں شاید
ماحول پہ چھائی ہوئی ہے اب بھی اُداسی

فریاد بہ لب آپ ہی تنہا نہیں نیرؔ!
اِس شہر میں کچھ آنکھیں کئی دن سے ہیں پیاسی

کوئی نہیں جو جان سے بڑھ کر ہم کو پیارا جانے ہے
لے دے کے اک دل ہی تیرا درد ہمارا جانے ہے

اُس نے میرا ساتھ دیا ہے اُسکو ایک ایک پل کی خبر
زخمی دل کے کرب کا عالم صبح کا تارا جانے ہے

اپنا اپنا درد ہے یارو، تم سے کوئی شکوہ نہیں
کس کے دل میں درد ہے کتنا غم کا مارا جانے ہے

موتی کس دامن میں گرے ہیں کس کا ہے آغوش تہی
مجھ سے نہ پوچھو شامِ الم پلکوں کا کنارا جانے ہے

کوئی نہیں بچنے کا طریقہ کشتی ہے اب طوفاں میں
ڈوبنے والا ایک اک پل تنکوں کا سہارا جانے ہے

تجھ سے شکایت کچھ بھی نہیں ہے اپنی اپنی قسمت ہے
تو نے کتنے زخم دیئے ہیں عالم سارا جانے ہے

تم کو تو معلوم ہے نیّرؔ! دل پر گہری چوٹ لگی ہے
دنیا چاہے جانے نہ جانے اپنا پیارا جانے ہے

دردمیں ڈوبی ہوی بات کہوں یا نہ کہوں
دلِ نم دیدہ کے حالات کہوں یا نہ کہوں

دل سے آتی ہے کراہوں کی صدا آخرِ شب
اس کو میں حاصلِ نغمات کہوں یا نہ کہوں

تم حقیقت میں ستم کار نہیں ہو لیکن
پھر بھی میں حسبِ روایات کہوں یا نہ کہوں

سی لیے ہیں لبِ اظہار ادب سے لیکن
اب نگاہوں سے وہی بات کہوں یا نہ کہوں

دل کا کیا وہ تو سلگتا ہی رہے گا لیکن
پلکیں بھیگی ہوں تو برسات کہوں یا نہ کہوں

اعتبار آ تو گیا ہے انھیں مجھ پر نیّر!
اپنے جیسے بھی ہیں حالات کہوں یا نہ کہوں

میت کو مری شب بھر اِس طرح سجا رکھنا
تم میرے سرہانے اک یادوں کا دیا رکھنا

یہ کہہ کے گیا کوئی با دیدۂ نم سے کل شب
آؤں کہ نہ آؤں میں دروازہ کھُلا رکھنا

توفیق نہ ہو جب تک رشتوں کو سمجھنے کی
بھیگی ہوئی پلکوں کو مصروفِ دعا رکھنا

ساون کی گھٹا بن کر جب تک نہ برس جاؤں
کلیوں کو مِرے گھر کی محرومِ صبا رکھنا

تنہائی کے عالم میں یہ بھی بڑی دولت ہے
کچھ زخم ملے ہوں تو سینے سے لگا رکھنا

وہ لمحہ جُدائی کا کیا جانئے کب آئے
سینے پہ مرے، سر کو تم اپنے سدا رکھنا

طے کرنا ہے لمحوں میں برسوں کی مسافت کو
نیّر! مرے آنے تک کچھ سانسیں بچا رکھنا

تاخیر سہی رسم نبھانے کے لیے آ
اے دوست! مرے گھر کو بسانے کے لیے آ

دب جاؤں نہ پھر بوجھ تلے اپنی انا کے
روٹھا ہوں بہت دن سے منانے کیلئے آ

مے خانے تلک جانے کی ہمت نہیں ہوتی
پیاسا ہوں تو احساس دلانے کے لیے آ

خوابوں میں بکھر جائے نہ پھولوں کی کہانی
سوئی ہوئی آنکھوں کو جگانے کے لیے آ

اے رسم جنوں! توڑ دے برسوں کی روایت
قاتل کو مسیحا سے ملانے کے لیے آ

برسوں سے یہاں کاسہ بہ کف ٹھہرا ہوا ہے
نیّر کی کبھی پیاس بجھانے کے لیے آ

عجب راحت ہوی محسوس کل شب غم گساری میں
میں اِک پل بھی نہیں سویا تمہاری پاسداری میں

ہمارے در پہ دستک دے کے ساری رات جو ٹھہرا
وہ اپنا گھر بھلا بیٹھا تھا شاید بے قراری میں

سرہانے آپ پاتے مجھ کو حرفِ شوق کی صورت
اگر کٹ جاتی ساری عمر بھی تیمارداری میں

وہی اندازِ دلداری، وہی مسلک، وہی لہجہ
نہ آیا فرق اب تک بھی تمھاری وضع داری میں

تمھیں بھی اپنے دامن پر اُسی وقت اعتبار آیا
ہزاروں پھول شامل ہو گئے جب اشکباری میں

فقط دستِ حنائی کے کرم سے کچھ نہیں ہوتا
تری نظروں کا جادو بھی ہے شامل حسن کاری میں

کچھ اِتنے دکھ ملے ہیں مجھ سے بھی اک شخص کو نیّر!
مرا بھیگا ہوا دامن ہے شامل شرمساری میں

آئینہ پھر مرے ہاتھوں سے گرا تیرے بعد
میں بہت دیر سے پہچانا گیا تیرے بعد

میرے ہاتھوں میں تری گرم ہتھیلی کے سوا
زندگی نے مجھے کچھ بھی نہ دیا تیرے بعد

اِس طرح سے تو اُٹھا چھوڑ کے محفل اپنی
پھر کسی گھر میں اُجالا نہ ہوا تیرے بعد

بال بکھرائے ہوئے ہر نئے موسم کی طرح
کتنی بے گھر سی ہوئی بادِ صبا تیرے بعد

گاہے گاہے ترے احساسِ جدائی کے سوا
میرے گھر کوئی نہ آیا نہ گیا تیرے بعد

اِتنی شدّت تھی ترے پیار میں وہ جی نہ سکا
تیرا شاعر، ترا نیّر نہ رہا تیرے بعد

دل، مستقل جُدائی کو تیار تو نہ تھا
اتنی بڑی سزا کا طلب گار تو نہ تھا

تا عمر برگِ گُل کی طرح تشنہ لب رہوں
میں اپنی تشنگی کا طلب گار تو نہ تھا

تیرا ہی یہ کرم ہے کہ شبنم نصیب ہوں
ہنستے ہوئے لبوں سے مجھے پیار تو نہ تھا

جو شہرِ گُل میں آیا تھا، زخمی بدن لیے
اوروں کا ہو گا میرا خریدار تو نہ تھا

آدابِ دوستی کا تو رکھنا تھا کچھ بھرم
ہر بات رد ہو یہ کوئی معیار تو نہ تھا

اپنی خوشی جو اوروں کے گھر بانٹتا پھرے
نیّر کے جیسا شہر میں غم خوار تو نہ تھا

قلندرانہ طبیعت بھی وضعدار بھی تھا
فقیر اپنے علاقے کا شہریار بھی تھا

قدم قدم پہ مری کج کلاہی حائل تھی
میں تجھ کو چھین لوں تجھ سے یہ اختیار بھی تھا

یہ آرزو تھی کہ آنکھوں میں ہم جگہ دیتے
غریب تھا وہ مگر دل کا مالدار بھی تھا

ہمیشہ آنکھیں اُس اک شخص کی جھکی ہی رہیں
وہ اپنی نرم نگاہی میں باوقار بھی تھا

وہ ٹھنڈی چھاؤں کا عادی ہی تھا تو رک جاتا
درخت مہر و مروّت کا سایہ دار بھی تھا

وہ اپنے غم کی امانت بھی مجھ کو سونپ گیا
وہ بدگمان سہی، مجھ پہ اعتبار بھی تھا

ہوئی نہ اُس سے کبھی کھُل کے گفتگو تیرؔ
وہ اپنے ترکِ تعلق پہ شرمسار بھی تھا

آج تک پردہ پڑا ہے کون پس منظر میں تھا
شہر جب جلنے لگا تھا میں بھی اپنے گھر میں تھا

جب نہ تھا معلوم کس کے سر سے چادر چھن گئی
کیوں ترا معصوم چہرہ میری چشم تر میں تھا

قافلے والوں نے تجھ کو راہ میں چھوڑا اگر
تیری منزل کا نشاں تو راہ کے پتھر میں تھا

سامنے لے جا کسی کے بے گناہی کا ثبوت
نام میرا بھی تو اک معصوم کے محضر میں تھا

دوستو! مہکی ہوئی کچھ تازہ یادیں ہی نہیں
زندگی کا اک ادھورا خواب بھی بستر میں تھا

سنگباری حق بہ جانب تھی مرے احباب کی
جب سے دیکھا ہے تمہیں پلنے کا سودا سر میں تھا

گھر تلک آئی تھی خوشبو پھر بھی پہچانا نہیں
ہنسنے رونے کا سلیقہ آپ کے تیور میں تھا

تمام عمر تو رونا ہے یہ کچھ تو ہنسا تھا
کسے خبر تھی ہمیں پیار کو ترسنا تھا

خدا سے لیتے لیتے میں نہ مانگتا آنکھیں
تمہاری دید کو گر عمر بھر ترسنا تھا

تمہارے قرب کی تسکین راس کیوں آئی
یہاں سے دور اگر تم کو جا کے بسنا تھا

لہو کی آگ سے زنجیر پا تو پگھلے گی
ذرا کچھ اور مرے بازوؤں کو کسنا تھا

کہاں تلک میں یونہی بوند بوند کو ترسوں
تم ابر تھے تو تمہیں ٹوٹ کر برسنا تھا

نکلتے ہم نہ کبھی کرب ذات سے نیر
غموں کے جال میں گر ہم کو یونہی پھنسنا تھا

کون آیا تھا کل گھر مرے کیا چھوڑ گیا ہے
ہر لمحہ تری طرح سے خوشبو میں بسا ہے

اِک عمر تلک کچھ مجھے معلوم نہیں تھا
میں کیا ہوں تمہیں دیکھ کے اندازہ ہوا ہے

دستک نہیں دی جاتی یہاں ایسے بھی گھر ہیں
جب چاہو چلے آؤ کہ دروازہ کھُلا ہے

آوازِ کفِ پا ہے نہ آہٹ ہے نہ ہلچل
یہ کون تری طرح مرے دل میں چھپا ہے

کس کرب میں گزری ہے بتا اے غمِ جاناں
تنہائی میں تُو بھی تو مرے ساتھ رہا ہے

اِک جھونکا ہوا کا ترے کوچے سے نکل کر
خوشبو تری زلفوں کی یہاں چھوڑ گیا ہے

کوتاہیِ پرواز نے پھر دیکھئے نیّرؔ!
شاہین مزاجوں کو نظر بند کیا ہے

لبوں پہ زخم ہیں نشتر مری تلاش میں ہے
ہے اتنی پیاس سمندر مری تلاش میں ہے

بس اتنی بات تھی آئینے دل کے جوڑے تھے
خلوصِ دوست کا پتھر مری تلاش میں ہے

اُجالے ڈھونڈنے جس گھر سے بھاگ نکلا تھا
سنا ہے آج بھی وہ گھر مری تلاش میں ہے

مرا ضمیر فسادات ہی میں قتل ہوا
یہ کس مقام کا خنجر مری تلاش میں ہے

میں اپنے دور کا سقراط تو نہیں لیکن
نہ جانے کیوں کوئی ساغر مری تلاش میں ہے

سحر فریب ہیں، یہ مہر و ماہ جھوٹے ہیں
شکستِ شام کا منظر مری تلاش میں ہے

سمٹ کے رہ گئے وہ روشنی کی باہوں میں
سُنا ہے جب سے کہ نیّر مری تلاش میں ہے

کبھی نہ اُٹھّے گا دستِ سوال آئندہ
ہم اپنے آپ سے خود ہو رہے ہیں شرمندہ

کفن کو ساتھ لیے ہم بھی گھر سے نکلے تھے
ہمارے خون سے تاریخ ہو گئی زندہ

نظر جھلس گئی اِس دور کے اجالوں سے
یہ عصرِ نو بھی ہے اب کس قدر درخشندہ

اُسی سے پوچھ لو اب کیا لہو کی قیمت ہے
یہ شخص بھی تو ہے اِس شہر کا نمائندہ

جہاں بھی تشنہ نگاہی کی رسم جاری ہے
عزیزو! میں بھی اُسی شہر کا ہوں باشندہ

نظر جھکائے دبے پاؤں پاس آنے سے
تمام پچھلی روایات ہو گئیں زندہ

یہی تو تازہ اُجالوں کا فیض ہے نیّر!
ہر ایک زخمِ نظر ہو گیا ہے تابندہ

اب زخمِ دل دکھانے سے کچھ فائدہ نہیں
شہرِ وفا میں کوئی بھی درد آشنا نہیں

دل زندگی کے زخم کو سہتا تو ہے مگر
پہلی نظر کی چوٹ کبھی بھولتا نہیں

ترکِ تعلقات کا یوں مشورہ نہ دو
تم رک گئے ہو راہ میں دل مانتا نہیں

اِس فصلِ گُل نے کتنے ہی دامن بھرے مگر
اپنے چمن میں ایک بھی غنچہ کِھلا نہیں

یارب! نہ بجھنے پائے کبھی شمعِ انتظار
پلکوں سے میری آخری آنسو گرا نہیں

آنکھوں میں بسنا چاہو تو آنسو ہیں درمیاں
دل کے قریب ہو تو کوئی فاصلہ نہیں

شہرِ غزل اداس ہے نیّر! اب چلے چلو
دیوانہ وار پھرنے سے کچھ فائدہ نہیں

خوشبو کا سفر ہو گا، میں تنہا نہ رہوں گا
سوچا تھا بچھڑ کر میں کہیں کا نہ رہوں گا

سہمے ہوئے لوگوں میں کہاں یاد کرو گے مجھ کو
جب میں بھی کسی گھر کا اُجالا نہ رہوں گا

پلکوں کی امانت ہیں مرے دوست! یہ آنسو
جب تک تو لگا ہوں میں ہے، پیاسا نہ رہوں گا

اک عمر کی محرومی رہے گی مرے ہمراہ
پہلے کی طرح اب میں اکیلا نہ رہوں گا

حالات اگر آپ کو لے آئیں مرے گھر
کچھ مصلحت ایسی ہے شناسا نہ رہوں گا

لمحات کی گرمی سے پگھل جاؤں گا نیّر!
لیکن میں کسی اور کا سایہ نہ رہوں گا

تم بھی اُس شاعرِ نم دیدہ سے مل کر کہنا
آج کے بعد کوئی شعر نہ مجھ پر کہنا

ہلکی ہلکی سی چبھن ہے ابھی کچھ نام نہ دو
دل کے جب زخم اُبھر آئیں گُلِ تر کہنا

گفتگو فیصلہ کُن آج تلک ہو نہ سکی
مانتا رہتا ہوں میں آپ کا اکثر کہنا

خوش نصیبوں نے لکھایا در و دیوار پہ نام
سائباں جب نہ ہو تم اپنا اُسے گھر کہنا

گھر کے آنگن سے قدم اُٹھ تو گئے ہیں لیکن
اُس نئے شہر کا اب کیسا ہے منظر کہنا

میں جواباً تمہیں کچھ بھی نہ کہوں گا نیّر!
بھول سکتے ہو مجھے آنکھ ملا کر کہنا

ہر لمحہ خاموش سوالی ہی رہے گا
جب آپ نہ ہوں گھر مرا خالی ہی رہے گا

جذبوں کی نئی شکل اُبھر آئے گی لیکن
تصویر کا خاکہ تو خیالی ہی رہے گا

ممکن نہیں بچ جائے یہ پتھراؤ کی زد سے
جب تک یہ مکاں اپنا سفالی ہی رہے گا

حالات بدلتے ہیں تو بدلا کریں لیکن
موسم کا ہر اک زخم مثالی ہی رہے گا

جس شخص نے ماحول کو پُر نور کیا ہے
اُس شخص کا چہرہ تو جمالی ہی رہے گا

خوابوں میں چلے آنے سے کیا ہوتا ہے نیّر
پیمانہ نگاہوں کا تو خالی ہی رہے گا

جو گزر رہے ہیں سہارے کے وہ بھی عادی ہیں
کسی کے مہندی لگے پاؤں اب بھی زخمی ہیں

کسے پتہ ہے زلیخائے فکر و فن کے لیے
بہت سی تہمتیں ہم نے بھی اپنے سر لی ہیں

پگھل پگھل کے تری گرم ان نگاہوں نے
تصورات کی دیواریں سب گرا دی ہیں

قدم قدم ہیں جو پر چھائیاں مرے ہمراہ
وہ نرم گرم طبیعت میں آپ جیسی ہیں

بنیں گے وہ بھی کسی دن زمین کا حصہ
کچھ ایسی باتیں ستاروں سے ہم نے کہہ دی ہیں

بس جو زخم بھی سہتے رہیں گے ہم نیّر!
کچھ اچھی عادتیں ہم نے بھی آپ سے لی ہیں

تا عمر ساتھ چلنے کا اک آسرا تو ہے
جھوٹا سہی پر آپ نے وعدہ کیا تو ہے

احساس تشنہ کامی پہ کم گفتگو سہی
اچھا ہوا کہ آپ سے اک سلسلہ تو ہے

اس شہر بے نوا میں ہوں دستک تو دے کوئی
دروازہ میرے دل کا ابھی تک کھلا تو ہے

اتنا دلاسا کافی ہے پہچان کے لیے
اندھوں کی بستیوں سے کوئی دیکھتا تو ہے

گھبرانا کیسا شہر حوادث میں دوستو!
سناٹا زندگی کا کبھی بولتا تو ہے

کس طرح دور ہوں گی یہ دیرینہ تلخیاں
اس ربط باہمی میں ابھی فاصلہ تو ہے

نیّر! ہو کس کے دیدۂ پُرنم کا تذکرہ
اشکوں کے انتخاب میں دامن جلا تو ہے

اِس طرح دوستی کا اثر چھوڑ جاؤں گا
چہرے پہ تیرے عکسِ نظر چھوڑ جاؤں گا

ماتھے کا زخم تجھ کو دلائے گا میری یاد
آئینہ تیرے گھر میں اگر چھوڑ جاؤں گا

تجھ سے بچھڑ کے پھر کبھی رونا اگر پڑے
دامن پہ تیرے دیدۂ تر چھوڑ جاؤں گا

زخمی ہوں ایسے حال میں اب جاؤں گا کہاں
جب بھی بھریں گے زخم تو گھر چھوڑ جاؤں گا

قربت رہے گی ترکِ تعلق کے بعد بھی
جلتے ہوئے میں رختِ سفر چھوڑ جاؤں گا

تنہائیوں میں جب بھی ترا دل اُداس ہو
تیرے لیے میں نورِ سحر چھوڑ جاؤں گا

نیّر! رہوں گا کتنا اکیلا میں اُس گھڑی
جس دن میں اُن کی راہ گزر چھوڑ جاؤں گا

مانا کہ نیا رشتہ سزاوار رہے گا
لافانی مگر آپ کا ہی پیار رہے گا

کروٹ پہ ہر اک میں ہی نظر آؤں گا ہر دم
درد آپ کا جب قابلِ اظہار رہے گا

پھر کوئی نہ ہوگا مری تنہائی کا ضامن
ہر شخص اگر تیرا طرفدار رہے گا

جس وقت بھی میں شہر ترا چھوڑ کے جاؤں
ہمراہ مرے صرف ترا پیار رہے گا

اُس سے کبھی ممکن نہیں اوروں کی رہائی
جو اپنی ہی اُلجھن میں گرفتار رہے گا

صدیاں بھی گزر جائیں مقابل سے نہ ہٹنا
نیّر کو تری دید کا اصرار رہے گا

نغمگی لہجے کی جس دن ساز بن کر رہ گئی
شخصیت اک شخص کی ممتاز بن کر رہ گئی

فرق کتنا پڑ گیا لہجہ بدل جانے کے بعد
عمر بھر کی دوستی اک راز بن کر رہ گئی

وہ صدا کل تک جو رہتی تھی مرے لب ہی کہیں
زندگی بھر دُور کی آواز بن کر رہ گئی

بے سبب تکتا ہوں میں ہر ایک چہرہ کو یہاں
خامشی جینے کا اِک انداز بن کر رہ گئی

رفتہ رفتہ دوستو اِس تشنگی کے دور میں
زندگی چھینا ہوا اعزاز بن کر رہ گئی

جانے کس بے نام سے رشتے کا نیّر فیض ہے
سیدھی سادی شاعری شہناز بن کر رہ گئی

اعزاز ہے یہ چشمِ خریدار کے لیے
ہم بھی کھڑے ہیں رونقِ بازار کے لیے

پہلے میں اپنی راہ کا پتھر ہٹا تو لوں
سوچوں گا پھر میں سایۂ دیوار کے لیے

اِک پل میں آج طے ہوا صدیوں کا فاصلہ
وقفہ بہت تھا سانسوں کی رفتار کے لیے

خاموش سی نگاہوں نے سب کچھ سنا دیا
کچھ بھی نہیں بچا لبِ اظہار کے لیے

کیا بات ہے کہ آپ کے ہاتھوں میں پھول ہیں
کیا لائے آپ مجھ سے گنہگار کے لیے

نیّرؔ! میں اپنے پاؤں کی زنجیر توڑ کر
آیا ہوں اپنے یارِ طرح دار کے لیے

لبِ خاموش ہوں، نہ گفتنی ہوں
بھری محفل میں رہ کر اجنبی ہوں

مجھے تم سوچ کر زہرابِ دینا
کئی پیاسے لبوں کی تشنگی ہوں

اندھیروں کے حوالے کرنے والو!
کسی محفل کی میں بھی روشنی ہوں

اجل تنہا پسندوں کے لیے ہے
مجھے دیکھو سراپا زندگی ہوں

جو مرجھائے گئے ہیں فصلِ گل میں
انھیں پھولوں کی میں بھی تازگی ہوں

تمہارے ساتھ ہوں برسوں سے لیکن
مجھے سمجھو تو میں بھی دیدنی ہوں

ہمیشہ بھیگتا رہتا ہوں نیّر!
نہ جانے کس کی پلکوں کی نمی ہوں

وہ سیدھا سادا سہی باوقار کتنا تھا
ہزار چہروں میں بھی پُر بہار کتنا تھا

خدا رکھے نہ کسی کو اسیرِ تنہائی
وہ روبرو تھا مگر بے قرار کتنا تھا

لکیر کھینچ کے ہم خود ہی ہو گئے محصور
تمہارے شہر کا ورنہ حصار کتنا تھا

میں اُس کی بزم سے اُٹھا تو یہ ہوا محسوس
اُس اجنبی کی نگاہوں میں پیار کتنا تھا

ہر ایک پیاسا مسافر ٹھہر گیا ہے وہیں
درخت پیار کا وہ سایہ دار کتنا تھا

وہ گھُٹ کے مر گیا جذبات کو زباں نہ ملی
یہ سوچتا ہوں اُسے اختیار کتنا تھا

وہ جل کے راکھ ہوا اپنی آگ میں نیّرؔ
کسے پتہ ہے کہ وہ سوگوار کتنا تھا

اک اجنبی سے جہاں دوستی بھی کرتے ہیں
اُسی حساب سے ہم دشمنی بھی کرتے ہیں

سفر طویل ہے تم احتیاط سے رہنا
جو رہ نما ہیں وہی رہزنی بھی کرتے ہیں

ہم اس لیے کہ سلامت رہے یہ مے خانہ
شریکِ جام کبھی تشنگی بھی کرتے ہیں

نشاطِ غم سے کہیں تم بہک نہ جاؤ کبھی
ہنسی میں اپنی کبھی ہم کمی بھی کرتے ہیں

حصارِ شہر میں ہم جیسے تازہ خانہ بدوش
رہینِ تشنہ لبی، زندگی بھی کرتے ہیں

وہ زندگی کے اچھوتے شگفتہ لمحوں کو
قریب لانے کبھی بے رُخی بھی کرتے ہیں

کبھی تو نیّرِ تاباں کو جا کے دیکھو بھی لو
کہ ان دنوں وہ ستم شاعری بھی کرتے ہیں

پہلے کی طرح وہ اب پیار جتاتے بھی نہیں
اور ہم روٹھ بھی جائیں تو مناتے بھی نہیں

ہر نئی صبح کو کچھ فاصلہ بڑھ جاتا ہے
اپنی قربت کا وہ احساس دلاتے بھی نہیں

عمر بھر مجھ کو بھٹکنے کا صلہ تو ملتا
آپ کچھ نقشِ قدم چھوڑ کے جاتے بھی نہیں

پیار کی ریت کا یہ جانے ہے کیسا انداز
میری بربادی کا وہ جشن مناتے بھی نہیں

تم وہ آئینہ صفت ہو کہ کوئی رنگ سہی
خود کو لوگوں کی نگاہوں سے چھپاتے بھی نہیں

اُن کو منظور ہے آنکھوں ہی میں رہنا تیرؔ
دل کے پیمانے میں وہ آکے سماتے بھی نہیں

اسیری تشنہ لب تھی اس لیے تاثیر ایسی تھی
قدم اُٹھتے نہیں تھے پاؤں میں زنجیر ایسی تھی

بہ صد اخلاص تیری بزم میں، میں بھی چلا آیا
تری شائستگی کی شہر میں تشہیر ایسی تھی

اگرچہ نیند تھی پلکوں پہ کچھ سننے کو جی چاہا
تمہاری بولتی آنکھوں کی کچھ تفسیر ایسی تھی

مجھے اِس آئینوں کے شہر میں اب کون پہچانے
میں اپنی شکل کھو بیٹھا تری تصویر ایسی تھی

مری وارفتگی، حرفِ ملامت بن گئی آخر
نہ آیا اعتبار اُس کو مری تقدیر ایسی تھی

محبت کی رکھی بنیاد ہم نے بے یقینی پر
وفا ملبے میں دب کر رہ گئی تعمیر ایسی تھی

اُجالوں کی تمنا تھی میں دھوکا کھا گیا نیّر!
نگارِ صبح کے ماتھے پہ کچھ تنویر ایسی تھی

میرے رفیق! اگر تُو ہی میرا سپنا تھا
ورق ورق پہ مرے دل کے آگے چھپنا تھا

میں بن گیا ہوں اگر گردِ رہ تو کیا غم ہے
تمہارے شہر میں کب تک مجھے پنپنا تھا

گلاب تازہ کی کچھ پتیوں میں لپٹا ہوا
شکن زدہ مرے بستر پہ تیرا سپنا تھا

میں کس کے واسطے خود کو سمیٹ کر رکھوں
بجز تمہارے مرے گھر میں کون اپنا تھا

میں اپنے پیار کی کرتا کچھ اور دل جوئی
تمہاری یاد میں گر عمر بھر تڑپنا تھا

خود اپنی ذات کی پہچان کے لیے نیّر!
تمام عمر مجھے اُس کا نام جپنا تھا

مانا کہ کل کا خواب حسین و جمیل تھا
لیکن نظر سے دور، بہت سنگ میل تھا

جذبات آنسوؤں کی زباں بن کے رہ گئے
اُس ایک شب کا فاصلہ کتنا طویل تھا

اپنی ہر ایک شکن کا وہی دے گا اب جواب
تنہائیوں کا آپ کی بستر کفیل تھا

ضد تھی کچھ ایسی تُو نے ہی خود کھو دیا اُسے
جس کا وجود تیری نظر کی دلیل تھا

سچّائیوں کی دے گا یہاں پر گواہی کون
ہر ایک لمحہ میری طرح سے قتیل تھا

نیّرؔ نگاہِ دوست سے بچنے کے واسطے
اپنے مقدمے میں، میں اپنا وکیل تھا

اب تو کسی بھی گھر میں نہیں روشنی تمام
پہلی کرن سحر کی، لہو پی گئی تمام

دیواریں اور اونچی ہوئیں رخصتی کے بعد
تاکید ہے کہ خط نہ لکھوں زندگی تمام

مانوس چشمِ نم سے میں پہلے کبھی نہ تھا
تیری ہی دین ہے مری آوارگی تمام

لب بستہ برگِ گُل سے صبا مل کے آئی ہے
ہونٹوں سے میرے پی چکی جب تشنگی تمام

اے دوست! جب بھی تشنہ لبی اور بڑھ گئی
پلکوں پہ آکے رُک گئی افسردگی تمام

نیّر! مہکتا رہتا ہوں خوشبوئے دوست سے
پھولوں سے گفتگو ہے مری شاعری تمام

جہاں بھی تو رہے ہے رہتا ہے دل میں تو اب بھی
دُعا کو اُٹھتے ہیں دو ہاتھ قبلہ رُو اب بھی

یہ کیسے تم تھے مسیحا کہ آکے لوٹ گئے
ہر ایک زخم ہے شرمندۂ رفو اب بھی

وہ اک شخص جو یادوں کا سلسلہ تھا کبھی
مرے خیال سے کرتا ہے گفتگو اب بھی

اگرچہ ترکِ تعلق کو عمر بیت گئی
مگر ہے آپ سے ملنے کی آرزو اب بھی

بہت ہے کافی ترے جرم کی گواہی کو
اِس آستیں سے ٹپکتا ہوا لہو اب بھی

سفید ہو گئیں پلکیں، نظر ہے چوکھٹ پر
مجھے ہے آپ کو پانے کی جستجو اب بھی

نہ جانے ہوتا وہ اب تک کہاں کہاں رسوا
ترے کرم سے ہے نیّر کی آبرو اب بھی

گجر بجا تو زباں چپ تھی ذہن، خالی تھا
ہر ایک شخص کا چہرہ یہاں سوالی تھا

قدم کسی کے اٹھے ہوں بنامِ سیرِ چمن
نصیبِ سبزۂ گلشن تو پائمالی تھا

ہوا کے دوش پہ بکھرے تھے گیسوئے جاناں
وہ خوشبوؤں کا سفر تھا مگر خیالی تھا

تمہارے گھر کی تو ایک ایک اینٹ باقی ہے
تمہارا گھر بھی تو میری طرح سفالی تھا

رہینِ تشنہ لبی سارے مے گسار رہے
یہ میکدہ تو تمہارا بڑا مثالی تھا

میں آنسوؤں کا صلہ کس سے مانگتا نیّرؔ!
نسیمِ صبح کا دامن بھی خالی خالی تھا

سکونِ قلب کی خاطر جو تم کو جینا تھا
کسی کے مہندی لگے پاؤں دھو کے پینا تھا

اگر عزیز تھا تم کو یہ رُت جگوں کا سفر
دریدہ دامنِ شب کو کچھ اور سینا تھا

ہوا کچھ ایسا کہ گردش میں ہم رہے برسوں
ہمارے ہاتھوں میں ساغر نہ رقصِ مینا تھا

تمھارے ہاتھوں سے کنگن جو ٹوٹ کر بکھرے
بساطِ فرش پہ ہر سمت اک نگینہ تھا

اسی لیے تو نہ سمجھوتہ ہو سکا ہم میں
انا پسندی تعارف کا پہلا زینہ تھا

کچھ ایسے ڈوبے کہ ساحل کی آرزو ہی رہی
گو ابتدا ہی سے منجدھار میں سفینہ تھا

وہ خود شناس رہا بھی تو کیا اسے نیّر!
خود اپنے طور پہ جینے کا کب قرینہ تھا

بہ قدرِ ظرف ہر اک شخص کو سنورنا ہے
کسے پتہ ہے کہ کس کو کہاں بکھرنا ہے

ہمیشہ اپنے بدن کو ڈھکا ہوا رکھنا
زمانہ وہ ہے کہ سایے سے اپنے ڈرنا ہے

بہت طویل ہے اے دوست خوشبوؤں کا سفر
ابھی تو دل کا نیا زخم ہم کو بھرنا ہے

کبھی تعینِ منزل کا فیصلہ بھی کرو
نہ جانے کب ہمیں جا کر کہاں ٹھہرنا ہے

تمام گھر میں اندھیروں کی کیا ضرورت تھی
تمہاری زلفوں کو اِس طرح گر بکھرنا ہے

کبھی تو دوستو! اِس شہر کے مکینوں سے
کوئی کرے نہ کرے ہم کو پیار کرنا ہے

وہ صبح، آس ہے جس کی کب آئے گی نیرؔ!
اس انتظار میں کب تک ہمیں ٹھہرنا ہے

پھر نئے موسم کی طاقت آزمانا ہے مجھے
اپنے گھر کو پھر حوادث سے بچانا ہے مجھے

جس کی پیشانی پہ کوئی نام کا پتھر نہیں
اک چراغ ایسا بھی تربت پہ جلانا ہے مجھے

آج گر نقشِ درودیوار ہوں تو کیا ہوا
ایک دن تیری گلی کو چھوڑ جانا ہے مجھے

آستانے سے اٹھا کر در بہ در جس نے کیا
ایسے دروازے کو اک دن کھٹکھٹانا ہے مجھے

ہو نہ جائے پھر کہیں مشکوک عرفانِ نظر
خود شناسوں کو بھی منظر سے ہٹانا ہے مجھے

اِس لیے ہے تیری قربت اِس قدر مجھ کو عزیز
تیری محفل سے بہت ہی دور جانا ہے مجھے

گُل بہ داماں آستانے مل گئے تو کیا ہوا
ماں کے قدموں پر بھی نیّرؔ سر جھکانا ہے مجھے

اپنی راہ پہ چلتے چلتے اُن کا رستہ بھول نہ جانا
راہِ وفا پُر خار بہت ہے پھر بھی سنبھلنا بھول نہ جانا

رسوائی تو ہو گی لیکن دل پہ بھی اک ضرب لگے گی
اشکوں پر الزام سے پہلے دامن اپنا بھول نہ جانا

بیتے ہوئے لمحوں کے رفیقو! ہم پہ یہ احسان بھی کر دو
جب بھی ہمیں کچھ لوگ بُھلائیں، یاد دلانا بھول نہ جانا

راہ میں تیری کب سے کھڑی ہیں آس کی ماری پاگل آنکھیں
شمعِ نظر بجھنے سے پہلے چہرہ دکھانا بھول نہ جانا

افسردہ ہے دل کی خاطر، پیار کی خاطر درد کی خاطر
زخموں کے شاداب چمن میں پھول کھلانا بھول نہ جانا

ہو نہ کہیں توہین تشنگی حرفِ وفا مجروح نہ کرنا
شمع کی لو پر آخرِ شب تک چپکے چپکے جلنا بھول نہ جانا

دل کا مارا نیّر تاباں پہلے سے وہ خود بھی دُکھی ہے
پاس بھی رہ کر دُور بہت ہے اُس کو بلانا بھول نہ جانا

مزاجِ دوستی اب اِس قدر بدلا ہوا کیوں ہے
محبت کرنے والوں کے دلوں میں فاصلہ کیوں ہے

مری روداد رہنے دو مگر تم پہلے یہ سوچو
زمانہ فیصلہ کرنے سے پہلے سوچتا کیوں ہے

کبھی فرصت میں تو بھی غور کر لے تیرے دامن کو
مری بھیگی ہوئی پلکوں سے آخر واسطہ کیوں ہے

شہادت آپ کے بھیگے ہوئے دامن کی کافی تھی
خلافِ چشمِ نم پھر دوستوں کا فیصلہ کیوں ہے

اگر مے کی کمی تھی آنسوؤں سے کام چل جاتا
مگر ساقی نے خالی جام رندوں کو دیا کیوں ہے

وفا نا آشنا جب تھا قتیلِ آرزو، اُس کو
زمانہ شہر کی گلیوں میں اب تک ڈھونڈتا کیوں ہے

یہ اہلِ بزم نیّر شمع کے آنسو ہی پیتے ہیں
کسی نے یہ نہیں پوچھا کہ پروانہ جلا کیوں ہے

ہجر کے دن کاٹنا احساسِ تنہائی نہ تھا
آپ سے ملنا کبھی تمہیدِ رسوائی نہ تھا

رفتہ رفتہ اپنی ہی پہچان کھو بیٹھوں نہیں
آپ سے ایسا کوئی ربطِ شناسائی نہ تھا

تازگی اُس کے لبوں کی جانے کس نے چھین لی
گفتگو میں پہلا سا اندازِ رعنائی نہ تھا

رہ گئے خود اپنی کم بینی سے پس منظر میں ہم
آپ پر لیکن کبھی الزامِ بینائی نہ تھا

سلسلے بے لوث چاہت کے ادھورے رہ گئے
غالباً تم کو بھی احساسِ پذیرائی نہ تھا

فاقہ مستی، بے نیازِ تشنگی ٹھہری مگر
آپ پر میرا کبھی طنزِ شکیبائی نہ تھا

احتراماً جھک گیا ہے سر، حضورِ دوست میں
مقصدِ سجدہ کبھی نیّر، جبیں سائی نہ تھا

کب میں نے کہا دل میں چھپانے کے لیے ہے
یہ خاک تو ماتھے پہ لگانے کے لیے ہے

فردوس بہ داماں سہی یہ سارے محلّے
کب تیری گلی چھوڑ کے جانے کے لیے ہے

ہم جیسے فقیروں کی پگھلتی ہوئی آواز
تم جیسے رئیسوں کو جگانے کے لیے ہے

بے وقت کی برسات یہ سیلاب یہ طوفان
بچھڑے ہوئے لوگوں کو ملانے کے لیے ہے

اب صحنِ گلستاں تہی دامن نہ رہے گا
یہ بادِ صبا پھول کھلانے کے لیے ہے

نیّر ا کبھی غم اپنا سرِ بزم نہ کہنا
کیا داغِ وفا سب کو دکھانے کیلئے ہے

تنظیمِ گلستاں اُسی قاتل کے ہاتھ ہے
منسوب جس سے شہر کی ہر واردات ہے

پھرتا ہے شہر شہر لہو کی تلاش میں
ہر لمحہ اُس کا منتظرِ حادثات ہے

تم کیا بچو گے اب نئے موسم کی ضرب سے
بربادیٔ چمن میں تمہارا بھی ہات ہے

راہِ وفا میں آج بھی تنہا نہیں ہیں ہم
ملبے سفر میں آبلہ پائی کا سات ہے

خوشبو کا یہ سفر کبھی رکنے نہ پائے گا
چلتا رہوں گا میری یہی کائنات ہے

نیّرؔ! رئیسِ شہر سے کیا گفتگو کریں
جب زندگی ہی سلسلۂ حادثات ہے

احتیاطاً کر ہی لیجے بات یہ بھی دل نشیں
آپ جب لوٹیں تو شاید میں رہوں گا ہی نہیں

میری تنہائی کا مونس میری فرقت کا رفیق
تیری ناقدری سے بڑھ کر کون ہوگا ہم نشیں

آپ کا احسان ہر لمحہ مجھے یاد آئے گا
تنگ ہو گی ایک دن میرے لیے جب یہ زمیں

بے دلی سے آپ نے چھوڑا تھا ہم کو جس جگہ
دیکھنا ہم بھی بس لیں گے کسی دن گھر وہیں

آپ کی خوشبو مرے آنگن سے ہو کر جائے گی
فاصلے کی قید ہی کیا آپ کا گھر ہو کہیں

غالباً پچھلے پہر بادِ صبا چھُو کر گئی
اس لیے مہکی ہوئی ہے آج پھولوں کی جبیں

ایک دن کاندھے پہ تیرے ہوگا اک مانوس سر
اپنی تنہائی سے نیّر! اتنا گھبرانا نہیں

اب کے آکر یوں رکوں گا تیرے در پر دیکھنا
تیرے کوچے سے ہی اٹھوں گا میں مر کر دیکھنا

کیا خبر کل کونسا موسم رہے گا مہرباں
پھر میں آؤں یا نہ آؤں آنکھ بھر کر دیکھنا

لوگ جب مقتل میں ہم کو پا بہ جولاں لائیں گے
اونچے محلوں سے ذرا نیچے اتر کر دیکھنا

بھول آیا ہوں کہاں میں عمر بھر کی تشنگی
میکدے میں گر نہیں تو اپنے گھر پر دیکھنا

رات جیسی کچھ ہو کٹ جائے گی پھر بھی صبح تک
میرا دامن ہی رہے گا چشمِ تر پر دیکھنا

پاؤں کی زنجیر بن کر شہر میں جب آؤں گا
تاج کانٹوں کا رہے گا میرے سر پر دیکھنا

پتھروں کے شہر میں نیّرؔ! چلے آتے ہیں آپ
چوٹ گہری تو نہیں ہے اپنے سر پر دیکھنا

دل جو ٹوٹا ہے تو آنکھوں میں بھی ساون آئے گا
میری پلکوں تک کسی دن تیرا دامن آئے گا

آبلہ پائی سے گھبرا کر نہ کر ترکِ سفر
پاؤں جب دہلیز پہ ہوں گے تو آنگن آئے گا

آپ اگر گھونگھٹ میں چہرہ یوں چھپاتے ہی رہیں
آپ کا دیدار کرنے کوئی درپن آئے گا

روٹھ کر تم اپنے گھر میں یونہی بس بیٹھی رہو
ایک دن تم کو منانے خود ہی ساجن آئے گا

آپ کو منزل شناسی پر نہ خوش فہمی رہے
پاس جب پہنچیں گے منزل کے تو رہزن آئے گا

آپ کے آنگن کی خوشبو ساتھ ہی آجائے گی
میرا لڑکا اپنے گھر جب لے کے دلہن آئے گا

آج پھر فصلِ خزاں کے تازہ تیور دیکھ کر
ایسا لگتا ہے کہ نیّر! زد میں گلشن آئے گا

بت شکن جب رفتہ رفتہ نقشِ آذر ہو گئے
پتھروں میں رہنے والے آئینہ گر ہو گئے

کس کو راس آیا یہاں جھوٹی قیادت کا بھرم
بے عمل آئے تو اونچے اور ممبر ہو گئے

شہر کے کچھ دوستوں سے اک تعلق یوں بھی ہے
زخم اِتنے جسم پر اُبھرے کہ زیور ہو گئے

ہاتھ اب کس سے ملائیں کس سے سمجھوتہ کریں
کل تلک جو پھول تھے وہ ہاتھ پتھر ہو گئے

کون کھینچے گا یہاں اب امن کی تازہ لکیر
خون کے دھبے ہی جب اپنا مقدر ہو گئے

شہر کی تاریخ کہلاتے رہے جو کل تلک
ایسے بھی کچھ لوگ نیّر! آج بے گھر ہو گئے

ہر ایک رُت میں یہاں مجھ سے کس کو کیا نہ ملا
سلوک پھر بھی رفیقوں کا قاتلانہ ملا

نہ ٹوٹا ترکِ تعلق کے بعد بھی رشتہ
انھیں سمجھنے مجھے کچھ نہ کچھ بہانہ ملا

وہ شخص جس کو کھُلی دشمنی گوارا تھی
ہمیشہ مجھ سے بہ اندازِ مخلصانہ ملا

دھویں میں لپٹے ہوئے شہر ہو گئے خالی
تمام خانہ بدوشوں کو جب ٹھکانہ ملا

خدا دکھائے نہ مفلس کی آنکھ میں آنسو
وہ ایسے خوش ہیں کہ جیسے کوئی خزانہ ملا

کچھ ایسے لوگ بھی تیرہ ہیں خانقاہوں میں
کہ جن کو ورثے میں اک ذہنِ تاجرانہ ملا

سوال سب کا ہے کس کے لبوں پہ پیاس نہیں
یہ بات الگ ہے بظاہر کوئی اداس نہیں

جنوں کی مُہر لگی ہے تو ہم بھی پی لیں گے
یہاں پہ زہر سے خالی کوئی گلاس نہیں

بہت سے لوگ تو اب بھی ہیں ذہن میں لیکن
تمہاری طرح مگر کوئی دل کے پاس نہیں

تمہیں بتاؤ کہ اب کس کو میں صدا دیتا
تمہارے غم کے سوا کوئی دل کے پاس نہیں

اک اضطراب مسلسل تو ہے نگاہوں میں
سمندروں کو جو پی لے ابھی وہ پیاس نہیں

بدن ہمارے شہیدِ دل کا ڈھانپنے کے لیے
وطن کی خاک سے بڑھ کر کوئی لباس نہیں

کسی کی پلکیں بھگونے سے فائدہ نیّر
تری نگاہ ابھی اِتنی غم شناس نہیں

بھولے بھٹکے ہوئے جس راہ سے ہم آتے ہیں
ساتھ ساتھ آپ کے بھی نقشِ قدم آتے ہیں

ماند پڑ جاتے ہیں جب بھی تری محفل کے چراغ
ہم تری بزم میں با دیدۂ نم آتے ہیں

دیکھنا یہ ہے کہ کس کس کا بھرے گا دامن
آج اِس بزم میں کچھ اہلِ کرم آتے ہیں

ہم کو اِتنا سرِ محفل تو نہ کیجے رسوا
آپ کی بزم میں کچھ سوچ کے ہم آتے ہیں

روشنی بزم کی آنکھوں میں سمٹ آتی ہے
اُٹھ کے محفل سے تری جب کبھی ہم آتے ہیں

صبح تک شمع کی پلکوں کو فروزاں نہ کرو
جن کو آنا ہے سرِ شامِ الم آتے ہیں

شہر میں پھرتے ہیں دیوانوں کی مانند مگر
نیّر اب پاس مرے ویسے بھی کم آتے ہیں

جب دل کو ضبطِ درد کے قابل بناؤں گا
پھر تیری انجمن میں مسلسل میں آؤں گا

جب تک چلے گی سانس یوں ہی مسکراؤں گا
لیکن لبوں پہ حرفِ شکایت نہ لاؤں گا

آنکھیں سنا رہی ہیں ادھوری کہانیاں
منہ پھیر لو گے تم تو میں کس کو سناؤں گا

توہینِ عشق ہوتی ہے وعدہ نہ لیجئے
ہے آپ میں کشش تو میں خود کھنچ کے آؤں گا

مجھ کو بھلا سکو تو بھلا دو بصد خوشی
لیکن کبھی کبھی میں بہت یاد آؤں گا

نیّر! چراغ بجھ گیا تھی آرزو یہی
محفل میں اُن کی شام و سحر جگمگاؤں گا

چاہت کے قرینے میں اگر زود اثری ہے
خاموش تکلم میں بھی تو اک نامہ بری ہے

تم ساتھ بھی ہو نقشِ کفِ پا بھی ہیں روشن
اب تم ہی کہو کس سے مری ہم سفری ہے

خود اپنی ہی گلیوں میں بھٹکتے ہیں ابھی لوگ
یہ شہرِ تمنا ہے کہ جادو نگری ہے

اے فصلِ خزاں! تم گُل ہم نہ کریں گے
کانٹوں سے گلستاں کی ابھی گود بھری ہے

تم رات کی بجھتی ہوئی شمعوں کو نہ دیکھو
روشن مری پلکوں پہ چراغِ سحری ہے

میں خاک نشینوں کو بھی یاد آؤں گا نیّر
جب تک مرے احساس میں آشفتہ سری ہے

اگر میں موردِ الزام ہوں تو سب کہیے
مگر خدا کے لیے کچھ نہ بے سبب کہیے

اداشناس وفا کو نہ بے ادب کہیے
میں بزمِ ناز کے قابل نہ ہوں تو تب کہیے

بہت دنوں سے زمانہ ہے گوش برآواز
کہانی غم کی اگر ہو تو زیرِ لب کہیے

میں انتظار تو کر لوں گا آپ کی خاطر
مگر چلے گی نگارِ نسیم کب کہیے

کہاں سے لاؤں گا میں عمرِ خضر جانِ وفا
جو کہنا آپ کو مجھ سے ہے آج اب کہیے

زمانہ بھر میں نہ رسوائیاں ہی رہ جائیں
کسی کا ذکر چلے کچھ نہ بے سبب کہیے

میں کچھ دنوں سے بہت ہی اداس ہوں نیر
حدیثِ مہر و وفا مجھ سے روز و شب کہیے

کہتے کہتے رکتے کیوں ہو دل میں جو ہے کہہ دو بھی
ہم بھی کوئی غیر نہیں ہیں اِتنا آخر سوچو بھی

کس نگری کا باسی ہوں میں کس کی خاطر آیا ہوں
اک دن اپنے پاس بلا کر مجھ سے اِتنا پوچھو بھی

جانا تو ہے سب کو لیکن آخر اِتنی جلدی کیوں
کب سے میں بیٹھا ہوں سرہانے آنکھیں اپنی کھولو بھی

سب کچھ چھوڑ کے آیا ہوں میں تم کو کیا معلوم نہیں
جاؤں کہاں محفل سے تمہاری آخر تم خود سوچو بھی

کب تک آنکھیں برسیں رِم جھم کب تک پلکیں بھیگیں گی
برہا رُت اب ختم ہوئی ہے آنکھیں اپنی کھولو بھی

کس نے دل پر ضرب لگائی اِتنے غمگیں نیّر کیوں
اتنے گُم صُم اِتنے چُپ چُپ آخر کچھ تو بولو بھی

فرزانہ تقاضائے وفا بھول رہا ہے
دیوانہ تری یاد میں مشغول رہا ہے

موسم کی کوئی قید نہیں کارِ جنوں میں
دیوانہ ہر اک رنگ میں مقبول رہا ہے

مقتل کی زمیں اب کبھی پیاسی نہ رہے گی
پھر موت کی باہوں میں کوئی جھول رہا ہے

میں یاد جو کرتا ہوں تو احساں نہ سمجھنا
یہ تو مرے ہر روز کا معمول رہا ہے

دنیا نظر انداز جو کرتی ہے تو کیا غم
افسوس کہ تو خود بھی مجھے بھول رہا ہے

جو گرمیٔ حالات سے تپتا رہا نیّرؔ
وہ شخص ہر اک دور میں مقبول رہا ہے

کب تک اپنے لیے پھولوں کا بچھونا ہوگا
وقت پڑ جائے تو کانٹوں پہ بھی سونا ہوگا

دل تو وہ شے ہے کہ اک بار جو ٹوٹا ٹوٹا
جو جُڑے دل نہیں، مٹی کا کھلونا ہوگا

چاہے مٹی کا پیالہ ہو کہ شیشے کی گلاس
آپ کے ہاتھ سے چھو جائے تو سونا ہوگا

فصلِ گل پھولوں کو ہاتھوں میں لیے ٹھہری ہے
آپ آ جائیں تو موسم بھی سلونا ہوگا

لوگ مرہم نہیں زخموں پہ نمک رکھتے ہیں
زخم گہرے ہوں تو اشکوں سے ہی دھونا ہوگا

اب بھی ہے وقت ذرا سوچ سمجھ لو نیّرؔ!
مجھ کو پانا ہے تو خود آپ کو کھونا ہوگا

کب تک مرے لہجے کے تاثر سے بچو گے
تم ایک نہ اِک دن مری آواز بنو گے

مانا دلِ نازک پہ ہر اک بات گراں ہے
لیکن مری باتوں کو بہت یاد کرو گے

مہکے گا ہر اک راستہ گلشن کی طرح سے
جس راہ سے بھی تم مرے ہمراہ چلو گے

اندیشۂ لغزش ہے بہت راہِ وفا میں
تم میرے بغیر ایک قدم چل نہ سکو گے

حالات تمہیں مجھ سے اگر دُور بھی کر دیں
احساس ہے زندہ تو مرے پاس رہو گے

جو کچھ تمہیں کہنا ہے وہ کہہ دو ابھی نیّر!
جذبات کو کب تک نظر انداز کرو گے

اِس شہرِ نگاراں میں ہیں سو طرح کے میلے
کچھ لوگ نظر آتے ہیں اب تک بھی اکیلے

اُن پھول سے قدموں کے لیے فرشِ چمن ہے
اِک آبلہ پا کے لیے کانٹے بھی نکیلے

تم جب سے محبت کی فضاؤں میں ہو تنہا
محسوس یہ ہوتا ہے کہ ہم بھی ہیں اکیلے

اک سانس بھی چل جائے سلیقے کی بہت ہے
فرصت ہی کہاں دیتے ہیں دنیا کے جھمیلے

صحرا کے مکیں رکھتے ہیں پھولوں کی تمنّا
دیوانے بھی ہوتے ہیں عجب رنگ رنگیلے

دیکھو وہ کہیں نیّرِ تاباں تو نہیں ہے
مانوس سے لگتے ہیں ہمیں بول سُریلے

میں نے یہ کب کہا کہ مری قدر کیجئے
لیکن مری وفا کا صلہ کچھ تو دیجئے

زخموں سے بڑھ کے کچھ نہ ملے گا حیات میں
اتنے قریب سے مجھے دیکھا نہ کیجئے

کاجل کی طرح میں بھی تھا آنکھوں میں آپ کی
نزدیک آ کے دیکھئے پہچان لیجئے

چلتا رہوں گا راہِ وفا میں تمام عمر
ہاں آپ تھک گئے ہوں تو آرام کیجئے

مدت کے بعد بچھڑے ہوئے دوست آئے ہیں
تنہائیوں کو میری نہ آواز دیجئے

نیّر! شعورِ غم کا سلیقہ اگر نہ ہو
دل کے معاملات کو رسوا نہ کیجئے

کل جو فریاد بہ لب آئے تھے بازاروں میں
وہ تو سب قتل ہوئے گلیوں میں بازاروں میں

خوں بہا مانگنا چاہیں بھی تو کس سے مانگیں
شہر کا شہر ہے قاتل کے طرفداروں میں

اور کیا چاہیئے مقتل کو سجانے کے لیے
خود مسیحا بھی ہے لاشوں کے خریداروں میں

لاشِ تہذیب کی رہ جائے گی بے گور و کفن
فیصلہ قتل کا جب تک نہ ہو سرکاروں میں

صرف بھیگی ہوئی مٹی کے سوا کچھ بھی نہ تھا
خون جب بہتا رہا شہر کے بازاروں میں

بے گناہی کا یقیں کیسے کریں گے ہم لوگ
صبح دم تم بھی تھے ٹوٹی ہوئی دیواروں میں

جن سے ہے تم کو بھی نیکی کی توقع نیّرؔ!
وہ تو اک عمر سے شامل ہیں گنہگاروں میں

درد نسبتاً کم ہے آج دل کے چھالوں میں
پھر بھٹک نہ جاؤں میں صبح کے اُجالوں میں

میں تو کچھ نہیں کہتا، خود ملاحظہ کیجے
کس کے اشک شامل ہیں زہر کے پیالوں میں

مستقل خموشی کا کچھ تو حل نکل آتا
تم اگر نہ کھو جاتے وقت کے سوالوں میں

نرم نرم لب ہیں یا پنکھڑی کنول کی ہے
بند ہے شفق اُن کے پھول جیسے گالوں میں

وہ چراغ، کل شب کو بجھ گیا سرِ محفل
جس کو ڈھونڈتے ہو تم صبح کے اُجالوں میں

زندگی کی راہوں میں یوں نہ چھوڑیئے نیّرؔ!
ہم بھی ہیں زمانے سے ساتھ چلنے والوں میں

نگاہ ملتی اگر دیدہ ور زمانے سے
تمہاری طرح میں بچتا فریب کھانے سے

ابھی ابھی تو ستاروں نے آنکھ کھولی ہے
ابھی سے اُٹھ کے نہ جاؤ غریب خانے سے

خرد کے دور میں تم، ہم سے کتنی دور رہے
قریبِ دل ہوئے تم، دل کے ٹوٹ جانے سے

سُنا ہے آپ کے دامن میں پھول کھلتے ہیں
کبھی کبھی مری پلکوں کے بھیگ جانے سے

خزاں کی رُت نے تو سب کچھ جلا دیا لیکن
کہاں میں جاؤں کہ نسبت ہے آشیانے سے

ہمیشہ اپنی ہی مرضی سے سانس لیتا ہوں
مجھے غرض نہیں نیّر! کسی زمانے سے

مجھ سے اِتنی پردہ داری، میں ہی اِتنا رسوا کیوں
تم کو جس نے دل سے چاہا اُس سے رشتہ ٹوٹا کیوں

پروانہ تو پروانہ ہے، جانے کیا انجامِ وفا
عشق کی تو پر جلنے والا اپنی آگ میں جلتا کیوں

پاؤں تو میرے زخمی ہی تھے تم کو کیا معلوم نہیں
جانا اگر تھا چھوڑ کے مجھ کو تم نے مڑ کر دیکھا کیوں

مجھ کو اور بھٹکنے دیتے منزل پر تو رُکنا تھا
راہِ وفا دشوار اگر تھی تم نے رستہ روکا کیوں

لوگوں نے جب آپ کو پوچھا، میں نے بتایا اپنا نام
بات تھی اِتنی معمولی سی اِس پر اِتنا غصہ کیوں

چرچے تھے بے لوث وفا کے پھولوں سے بھی رشتہ تھا
راہِ وفا پُرخار اگر تھی آپ کا دامن اُلجھا کیوں

جو کچھ بھی حالات تھے نیّرؔ! تم نے کبھی یہ غور کیا؟
رشتۂ دل نازک تو بہت تھا، اِتنی جلدی ٹوٹا کیوں

جب کبھی تم نے مرے قلب کو آباد کیا
میں نے ہر لمحہ کئی بار تمہیں یاد کیا

رہ گیا تیرا تصور بھی مجسّم بن کر
میں نے جس وقت سلیقے سے تجھے یاد کیا

آپ نے دادِ وفا دی نہ کبھی بھولے سے
پھر بھی کیا ہم نے کبھی شکوۂ بیداد کیا

اب مسرّت کے تصوّر سے بھی جی ڈرتا ہے
قیدِ غم سے مجھے کیوں آپ نے آزاد کیا

بھیگی پلکوں کی قسم رات کی تنہائی میں
بھولنے والے! تجھے ہم نے بہت یاد کیا

ہائے خوشیوں نے بھی کس وقت صدا دی نیّر!
دل کو جب ہم نے غمِ عشق سے آباد کیا

سوچتا ہوں کہ وفاؤں کا صلہ کیا ہوگا
تیرے دیوانے کو دنیا نے دیا کیا ہوگا

تم نے آنے میں بہت دیر کی کیا نذر کروں
اب مری چشم میں اشکوں کے سوا کیا ہوگا

تجھ کو یہ ضد کہ گزر جائے گی جیسے کچھ ہو
مجھ کو یہ فکر مرے بعد ترا کیا ہوگا

ہونٹ ہلتے نہیں اندیشۂ رسوائی سے
مجھ سے بڑھ کر کوئی محتاطِ وفا کیا ہوگا

اب گلستاں میں نظر آتی نہیں آتشِ گُل
اب کے اِس فصلِ بہاراں کو ہوا کیا ہوگا

بے نیازی سے جُدا ہوگئے وہ بھی نیؔر!
یہ نہ سوچا مری دنیا میں رہا کیا ہوگا

جو کچھ بھی آپ کہتے ہیں وہ ٹھیک ہی تو ہے
مقتل میں زندگی کی طلب بھیک ہی تو ہے

جب چھین لی گئی مری آنکھوں سے روشنی
دنیا مِری نگاہ میں تاریک ہی تو ہے

رشتوں میں امتیاز نہ کرنا کبھی کبھی
شائستگیٔ عشق کی تضحیک ہی تو ہے

کس آرزو سے میں نے بڑھایا تھا اپنا ہاتھ
تم نے بھی ساتھ چھوڑ دیا ٹھیک ہی تو ہے

گھبرا رہا ہے دل تو تعجب کی بات کیا
منزل نگارِ شہر کی نزدیک ہی تو ہے

پھولوں کے پیرہن پہ نظر جم گئی تو کیا
یہ آمدِ بہار کی تحریک ہی تو ہے

پروانہ تو یہ شمع کی خاموش جل گیا
نیّر! کہانی ختم ہوئی ٹھیک ہی تو ہے

کیوں سکوں ملتا نہیں ہم کو تمہاری یاد سے
کونسا بدلا لیا تم نے دلِ ناشاد سے

آج دونوں کا مزاجِ درد ہم آہنگ ہے
آپ کی آواز آتی ہے مِری فریاد سے

ہو اگر احساس میں شدّت تو پھر اے ہم نشیں
ایک لمحہ بھی بہت ہے عمر بھر کی یاد سے

اب مرے آنسو بھی تیری آنکھ سے گرنے لگے
اِس قدر مانوس کیوں ہے تُو مری فریاد سے

مستقل محرومیوں سے بڑھ کے تم دیتے بھی کیا
کیا ملا ہم کو تمہاری عمر بھر کی یاد سے

دھڑکنیں بھی اب ہماری وقفِ شامِ غم ہوئیں
اور کیا لینا ہے تم کو اب دلِ ناشاد سے

صبح خنداں بھی نہیں ہے شام گریاں بھی نہیں
کس کو میں آواز دوں نیّرؔ دلِ برباد سے

اُن کی زلفوں میں جو بل ہو تو غزل ہوتی ہے
جب بھی نیندوں میں خلل ہو تو غزل ہوتی ہے

دامنِ گنگ و جمن لاکھ دل آویز سہی!
سامنے تاج محل ہو تو غزل ہوتی ہے

خونِ ارماں ہو تو ہوتے ہیں مہکتے ہوئے شعر
خونِ دل اشک میں حل ہو تو غزل ہوتی ہے

شمعِ عارض تو فروزاں ہے تخیّل میں مگر
اُن کے ہونٹوں پہ کنول ہو تو غزل ہوتی ہے

طبعِ موزوں سے بہت شعر تو ہو جاتے ہیں
کوئی عنوانِ غزل ہو تو غزل ہوتی ہے

تازگی اس کے لب و عارض و رُخ کی نیرؔ!
میرے احساس میں حل ہو تو غزل ہوتی ہے

یہ سوچا بھی نہ تھا اک دن بچھڑ جائیں گے ہم دونوں
وفا کے ذکر تک سے دنیا کو یاد آئیں گے ہم دونوں

یہ مفہومِ وفا دنیا کو سمجھائیں گے ہم دونوں
کسی دن آتشِ غم سے ہی جل جائیں گے ہم دونوں

وفا نا آشنا راہی بھی منزل اپنی پا لیں گے
کچھ ایسے نقشِ پا رستوں میں چھوڑ آئیں گے ہم دونوں

تری دنیا سے اب اے بے بسی! دامن چھڑا کر ہم
کبھی تو نے یہ سوچا ہے کہاں جائیں گے ہم دونوں

کہاں تک ضبطِ غم، کب تک شکستہ دل کو سمجھائیں
کہاں تک اب دلِ ناداں کو سمجھائیں گے ہم دونوں

یہ خوش فہمی نہیں نیّر! محبت اس کی ضامن ہے
وفا کی ایک اک منزل پہ یاد آئیں گے ہم دونوں

ہر زہر ترے نام سے خاموش پیوں گا
اُس لطف و کرم کی میں شکایت نہ کروں گا

گھبراؤ نہیں پیار کو رسوا نہ کروں گا
تم پاس سے گزرو بھی تو آواز نہ دوں گا

اِن بھیگتی راتوں نے بہت ساتھ دیا ہے
اوروں کی طرح میں اُنھیں رسوا نہ کروں گا

اے شمعِ وفا! درد کی لو اور بڑھا دے
پروانے کی مانند میں چپ چاپ جلوں گا

رسوائی کا احساس ہے گر آپ کو اِتنا
میں عرضِ تمنّا میں بھی محتاط رہوں گا

برسوں سے گرفتارِ حوادث ہوں رفیقو
ہاں! تم سے کسی دن میں سرِ دار ملوں گا

نیّر کی طرح مجھ کو بھُلانا نہیں آساں
کانٹے کی کھٹک بن کے ترے دل میں رہوں گا

پہلے ہی خط کا تمہارے شہر میں چرچا ہوا
کتنے کم داموں میں میرے پیار کا سودا ہوا

رفتہ رفتہ بزم کی شمعیں بجھیں تو کیا ہوا
میری پلکوں پر ہے اک آنسو ابھی ٹھہرا ہوا

کب تلک تم اپنے زخموں کا کروگے تذکرہ
ایک نشتر میرے پہلو میں بھی ہے اترا ہوا

زندگی کی طرح تم کو بھی بھلا بیٹھا تھا میں
تم ملے تو دل کا ہر اک زخم پھر تازہ ہوا

اب تو اپنے آپ کو بھی بے وفا کہتا ہوں میں
میری شائستہ طبیعت کو نہ جانے کیا ہوا

اب تو آنسو پونچھ لو نیرؔ! سحر ہونے کو ہے
ہائے! کب تم کو ہمارے غم کا اندازہ ہوا

جہاں دیوانہ اک پل بھی رُکے گا
تمہیں بھی آخری آواز دے گا

بساطِ گُل ہو یا دامانِ صحرا
جُنوں کا قافلہ چلتا رہے گا

ترے دامن کی شہرت تو بہت ہے
مرے اشکوں کی قیمت کون دے گا

دیارِ دل میں آپ آئیں نہ آئیں
چراغِ آرزو جلتا رہے گا

نشاطِ غم کی جس کو جستجو ہے
سکونِ دل ملے تو کیا کرے گا

اگر یادیں بھی ہم سے چھین لوگے
ہماری زندگی میں کیا رہے گا

اندھیرے گھر میں کون آئے گا نیّرؔ
فریبِ روشنی جب تک رہے گا

کس خنجرِ قاتل کا رشتہ ہے مرے سر سے
سر لے کے ہتھیلی پہ نکلا ہوں میں اب گھر سے

شاید یہی لکھا ہے ہاتھوں کی لکیروں میں
آئینہ صفت رہ کر ٹکرانا ہے پتھر سے

خوشبو کا مسافر ہوں چلتا ہی رہوں گا میں
مانوس میں اب تک ہوں اک برگِ گلِ تر سے

کانٹوں کا بچھونا ہے شاید مری قسمت میں
اُکتا سا گیا ہوں میں پھولوں بھرے بستر سے

تخلیق کے منصب میں سب ایک ہی جیسے ہیں
رشتہ تو نہیں کوئی اِس دَور کے آذر سے

اے دیدۂ گریاں میں اب اُٹھ کے کہاں جاؤں
اک رشتۂ دیرینہ ہے آج بھی تیرے در سے

تم کو خوش فہمی ہے اک دن راہ پر آجائے گا
صبح کا بھٹکا مسافر، رات گھر آجائے گا

پیار خوشبو کا سفر ہے چل رہا ہوں صبح و شام
اِک نہ اِک دن راہ میں تیرا بھی گھر آجائے گا

منتظر کوئی تو ہوگا صبح کی دہلیز پر
ایک دن جب اپنے گھر تُو لوٹ کر آجائے گا

آپ کو بھی لوگ پہچانیں گے اپنے شہر میں
پیار کا الزام جب بھی میرے سر آجائے گا

پھر کسی کو بھی نہ ہوگا کم لباسی کا گلہ
تیرا دامن میرے ہاتھوں میں اگر آجائے گا

اُس کو نیّر! خود پہ بھی کچھ اعتبار آنے تو دو

بکھرے بکھرے سے ہیں کیوں پھولوں کی چادر کی طرح
گفتگو آپ سے کب ہوگی گلِ تر کی طرح

صبح نو بن کے میں پلکوں پہ ٹھہر جاؤں گا
جب بھی دیکھو گے مجھے ڈوبتے منظر کی طرح

سوچتا رہتا ہوں اب پھولوں کی نرمی ہے کہاں
آپ کا لہجہ ہے چبھتے ہوئے نشتر کی طرح

کون دے گا مجھے وہ لمحۂ تسکینِ نظر
کب سے گردش میں ہوں میں گردشِ ساغر کی طرح

خائف ہوں کی امانت میں لیے پھرتا ہوں
کس کو اب پاؤ گے مجھ جیسے قلندر کی طرح

جانے کس سمت سے کب آئے گی تازہ خوشبو
میں بھی اک عمر سے ہوں اجڑے ہوئے گھر کی طرح

میرے کمرے سے نہ لوٹی کبھی خوشبو نیّر!
کون آیا تھا مہکتے ہوئے پیکر کی طرح

ملا تو ایسا کہ سب سے جُدا ہوا ہے کوئی
رہا تو مجھ سے مسلسل خفا رہا ہے کوئی

نسیمِ صبح کے ہمراہ، چشمِ نم لے کر
بہت قریب سے ہو کر گزر گیا ہے کوئی

سفر زمین کا یا رب! کہاں تلک ہوگا
سمندروں سے بھی آگے نکل گیا ہے کوئی

رُکے رُکے سے قدم ہیں بدن ہے سمٹا ہوا
نظر جھکائے مرے پاس آ رہا ہے کوئی

ترا خیال ہے جب سے رفیقِ تنہائی
فریب دے کے مسلسل بلا رہا ہے کوئی

نہ جانے کون سی راہوں سے ہو کے گزرے گا
ہماری بزم سے اُٹھ کر ابھی گیا ہے کوئی

زندگی آپ سے کب چشمِ مروّت مانگے
دلِ دیوانہ تو برسوں کی رفاقت مانگے

شب کے زینوں سے چلے آنا دبے پاؤں کبھی
تم سے قربت کے سوا کچھ نہ محبت مانگے

پاس اب کچھ بھی نہیں درد کی دولت کے سوا
تجھ سے کیوں دل مرا برسوں کی امانت مانگے

بال بکھرائے ہوئے شانوں پہ آجاؤ کبھی
ذوقِ نظّارہ وہی قد وہی قامت مانگے

آ بھی جا خسروِ عیسیٰ نفساں آج کی رات
دلِ بیمار فقط تیری ہی قربت مانگے

جب سے آئینہ بنا سنگِ ملامت نیّر
میری آشفتہ سری چشمِ بصیرت مانگے

یہ سچ ہے کہ اب شہر سے وہ دُور کہیں ہے
لگتا ہے مگر اب بھی مرے گھر میں مکیں ہے

ناخواستہ مہماں کی طرح قافلہ دل کا
چھوڑا تھا جہاں تم نے ابھی تک وہیں ہے

جس کو مرے ہونٹوں نے لکھا تھا بصد اخلاص
اب تک مری آنکھوں میں جھلکتی وہ جبیں ہے

کھوئے ہوئے رہ کر تمہیں پانے کی تمنا
یہ جرم سہی میرا مگر کتنا حسیں ہے

حصّہ نہ بنا زیست کا خوشبو کا وہ لمحہ
اُس بزم سے اُٹھ جانے کا افسوس نہیں ہے

رُک جاتے ہیں مجھ جیسے گنہ گار بھی نیئرؔ!
پیوندِ زمیں کون یہاں خاک نشیں ہے

دکھلایا مقدر نے اک ایسا بھی نظارہ
تسکینِ نظر ہوگئی، دل رہ گیا پیاسا

ہم نے تمہیں رکھا تھا یہاں کتنے جتن سے
اک پل ہی میں کیوں چھن گیا برسوں کا اثاثہ

جب اپنی زمیں چھوڑ کے پرواز کر و گے
بکھرے گا یہاں ٹوٹ کے ہر ایک شناسا

یہ غم تو ہمیشہ ہی رہے گا مرے ہمدم
جی بھر کے تمہیں وقتِ سفر دیکھ نہ پایا

اب گھر میں اندھیروں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے
تم جب سے گئے ساتھ گیا گھر کا اجالا

بہتر ہے کہ پلکوں ہی میں اشکوں کو چھپالیں
جو خود ہے دکھی، دے گا وہ کس کس کو دلاسا

ہر شخص یہاں اپنی ہی پہچان میں گم ہے
نیّر! یہاں ہم کس کو کہیں جان سے پیارا

تہی ابھی مرا دستِ سوال رہنے دو
نظر کی حد میں ہے حُسن و جمال رہنے دو

ابھی تو آئی کہاں ہے وہ فیصلے کی گھڑی
دل و نظر کو ابھی ہم خیال رہنے دو

بہت عزیز ہیں دن رات میزبانی کے
تم اپنا فیصلہ اب اگلے سال رہنے دو

ہمارا پیار رہے رشتوں کی قید سے آزاد
ہمارے پیار کو بھی لازوال رہنے دو

پہنچ ہی جاؤں گا اک دن میں سرحدِ غم تک
اسی طرح سے مجھے پائمال رہنے دو

میں ٹوٹ ٹوٹ کے اصلاح اپنی کر لوں گا
نظر میں اپنی مجھے باکمال رہنے دو

وہ اب نہیں تو کسی دن تو آئے گا نیّر!
نظر میں اپنی وہ پہلا سوال رہنے دو

نیند اپنی چھوڑ کر خوابوں کا بستر لے گیا
کوئی گھر آکر مرے، سب کچھ اٹھا کر لے گیا

اب تو آنگن میں مرے خوشبو کا جھونکا بھی نہیں
میرے گھر کی ساری خوشیاں دیدۂ تر لے گیا

جس نے آہٹ بھی نہ چھوڑی اسکو اب ڈھونڈوں کہاں
اپنی خوشبو تک وہ آنچل میں چھپا کر لے گیا

جانے کیسی آس تھی احساس محرومی مجھے
آستانِ یار جب چھوٹا تو گھر گھر لے گیا

جب کبھی ترکہ میں سجادہ نشیں الجھے رہے
ساری پونجی خانقاہوں کی قلندر لے گیا

فرش پر چلتے ہی تیرا پاؤں زخمی ہو گئے
آئینوں کے گھر میں جانے کون پتھر لے گیا

افسوس نہیں مجھ کو تری حرف زنی کا
جاں سوز ہے لیکن ترا غم کم سخنی کا

رکھ دوں گا تری نرم ہتھیلی پہ میں آنکھیں
احساس ستائے مجھے جب بے وطنی کا

اچھا تو یہی تھا کبھی گھر سے نہ نکلتے
خدشہ تھا جو رہبر سے تمہیں راہ زنی کا

اک قطرۂ شبنم نہ ملا تشنہ لبوں کو
یہ کون سا انداز ہے خاطر شکنی کا

گلشن میں کوئی پھول تبسم کو نہ ترسے
گر عکس بھی پڑ جائے تری گل بدنی کا

غربت میں اگر خاک وطن تھوڑی بھی مل جائے
افسوس نہیں ہوگا مجھے بے کفنی کا

اب کون ادھر تیشہ بکف آئے گا نیرؔ!
اب نام ہی باقی ہے یہاں کوہ کنی کا

کب مرا ٹوٹا ہوا گھر پھر مکاں ہو جائے گا
کب زمیں پہ رہنے والا آسماں ہو جائے گا

آپ تو جائیں گے لیکن میں نے یہ سوچا نہ تھا
زندگی کا ہر سہارا بے زباں ہو جائے گا

کس کو اب پہچان لوگے کس کو ڈھونڈوگے یہاں
ہر پرانا زخم ہی جب بے زباں ہو جائے گا

تب میں سو جاؤں گا تنہائی کی چادر اوڑھ کر
سایۂ ابرِ رواں جب سائباں ہو جائے گا

انتظارِ دوست کی جس وقت بھی ٹوٹے گی آس
میرا جینا مرنا سب یہ کچھ رائیگاں ہو جائے گا

کیا کروں سب کچھ بھی اب سہتے ہوئے خاموش ہوں
اک نہ اک دن وہ بھی مجھ پر مہرباں ہو جائے گا

اپنے گھر رکھوں گا نیّر! ایک مہماں کی طرح
درد بڑھتے بڑھتے جب بھی بیکراں ہو جائے گا

محفل میں سب رہیں گے افسوس ہم نہ ہوں گے
بچھڑے ہوئے ملیں گے افسوس ہم نہ ہوں گے

یادوں کی انجمن میں ہم بھی رہیں گے لیکن
جب زخم دل بھریں گے افسوس ہم نہ ہوں گے

محفل میں مہ رخوں کی ہمدردیاں جتانے
سب اجنبی رہیں گے افسوس ہم نہ ہوں گے

دیوانے میکدے میں ساقی سے منہ چھپا کر
جب زہر غم پئیں گے افسوس ہم نہ ہوں گے

بھٹکے ہوئے مسافر گم کردہ راہ راہی
منزل پہ جب رکیں گے افسوس ہم نہ ہوں گے

انجام سے گریزاں شمع وفا کی لو پر
پروانے جب جلیں گے افسوس ہم نہ ہوں گے

فرزانے زندگی بھر نیتر کا نام لے کر
رسوا تمہیں کریں گے افسوس ہم نہ ہوں گے

دل میں کسی کی فرقت کانٹے چبھو رہی ہے
تنہائیوں کی دیوی پھولوں پہ سو رہی ہے

میں زندگی سے تنگ کر آیا تھا میکدہ میں
اُس کی کمی یہاں بھی محسوس ہو رہی ہے

طوفاں سے بچا کر لائی حیات لیکن
ساحل کا نام لے کر کشتی ڈبو رہی ہے

تنہائیوں کی ضامن یہ رات کی خموشی
زخموں کو زندگی کے اشکوں سے دھو رہی ہے

یہ کیسی فصلِ گُل ہے، کیسی بہار آئی
پھولوں کی زندگی پر شبنم بھی رو رہی ہے

پھر اُس کی یاد آئی شدت سے مجھ کو نیّر
پھر ٹیس میرے دل میں محسوس ہو رہی ہے

ذوقِ طلب کا تم نے وفا نام رکھ دیا
اہلِ جنوں پہ عشق کا الزام رکھ دیا

قابو میں آ گئے مرے بہکے ہوئے قدم
ساقی سے جب نگاہ ملی جام رکھ دیا

راہِ وفا میں رک گئے جب پیار کے قدم
نام اُس کا تم نے گردشِ ایام رکھ دیا

ہے کس کا کتنا ظرف مجھے آزمانے دو
میں نے تو زندگی کا بھرا جام رکھ دیا

ساقی نے میرے سامنے حسبِ روایت آج
ساغر کے بدلے ٹوٹا ہوا جام رکھ دیا

مایوسیوں سے پہلے ہی نشتر تمہیں کہو
دستِ تہی میں کس نے بھرا جام رکھ دیا

دلِ ونگاہ کی شمعوں کا کچھ تو ہو گا سبب
پگھل رہی ہیں تری بزم میں جو روز و شب

وہ دیر ہو کہ حرم، دشت ہو کہ صحنِ چمن
کسی مقام پہ رکتے نہیں ہیں پائے طلب

نسیمِ صبح نے جب بھی تمہارا نام لیا
چمن میں کھل گئے غنچوں کے خوبصورت لب

ترا سلوک تو یوں بھی تھا زیرِ غور مگر
مری وفا پہ ترا طنز بھی ہے غور طلب

اندھیری رات میں بھی دل کا قافلہ ہے رواں
کئی چراغ ابھی جل رہے ہیں زیرِ لب

شبِ فراق کا دامن سلگ نہ جائے کہیں
یہ کس کا درد میں ڈوبا ہوا ہے نالۂ شب

ابھر رہے ہیں کچھ اس طرح زخمِ دل تیرا!
کہ جیسے لوٹ کے آئے ہیں میرے روز و شب

جب پیکرِ مرمر کی یاد دل میں غزل ہوگی
دنیائے ادب میں وہ اک تاج محل ہوگی

تر ہوگا ترا دامن، بھیگے گا ترا آنچل
پلکوں کی نمی میری جب رو بہ عمل ہوگی

کچھ محفلیں ایسی ہیں یاد آئیں گی ہر لمحہ
جب آپ کی تنہائی احساس میں حل ہوگی

ہم وقت کے سینے میں دل بن کے دھڑکتے ہیں
ہم آج ہی کہتے ہیں وہ بات جو کل ہوگی

کھلتے ہوئے ہونٹوں پر تھے تازہ کنول کتنے
یہ تیری خموشی بھی برسوں ہی کا حل ہوگی

مایوس نہ ہو جانا تم میری خموشی پر
پھر آؤں گا محفل میں جب تازہ غزل ہوگی

یک لخت بھرم دل کا کھل جائے گا اے نیّر
رودادِ محبت جب فریاد میں حل ہوگی

جب کبھی دل میں خیالاتِ حسیں آتے ہیں
کتنے بھولے ہوئے غم دل کے قریں آتے ہیں

لڑکھڑاتے ہیں جہاں تخت نشینوں کے قدم
ایسی راہوں سے بھی ہم خاک نشیں آتے ہیں

محفلِ دل میں ذرا جشنِ چراغاں کر لوں
درد و غم ساتھ لیے دل کے مکیں آتے ہیں

ہو نہ مہمانوں کے اعزاز میں تھوڑی بھی کمی
آج اِس بزم میں کچھ زہرہ جبیں آتے ہیں

دوستو! آؤ ہے میخانہ یہی اپنا مقام
شہر میں جتنے ہیں بدنام یہیں آتے ہیں

دیر تک تیر تاباں کو پکارا نہ کرو
جانے والے کبھی واپس بھی کہیں آتے ہیں

محبت آشنا کا بس یہی انجام ہوتا ہے
زباں کھلنے سے پہلے موردِ الزام ہوتا ہے

شعورِ غم سلامت! زندگی کی یہ علامت ہے
مقابل درد کے تنہا دلِ ناکام ہوتا ہے

مجھے بے مہریٔ حالات سے شکوہ نہیں کوئی
کوئی غم ہو، عطائے گردشِ ایام ہوتا ہے

نہ رندوں کی یہ محفل ہے نہ بزمِ ساغر و مینا
یہ کس محفل میں جشنِ حافظ و خیام ہوتا ہے

تجھے کس نام سے آواز دوں میں اے "گلِ تازہ"
یہاں کا ہر شگفتہ گل، ترا ہم نام ہوتا ہے

دلوں کی تہ کو چھو لیتی ہے نیّرؔ اس کی ہر "دھڑکن"
جو شاعر زندگی میں ہر طرح ناکام ہوتا ہے

مسندِ سجادگی جب چھین کر لائی گئی
تھی قلندر کی امانت اس کو لوٹائی گئی

صبحِ آزادی اجالوں کی ضمانت تھی مگر
اس ادا سے روشنی آئی کہ بینائی گئی

ریزہ ریزہ جب ہوئے ہم آئینوں کے شہر میں
ہم کو اپنی دوسری تصویر دکھلائی گئی

مطمئن تھے ہم گر موسم بدل جانے کے بعد
میکدے کی پھر وہی تاریخ دہرائی گئی

حادثوں کی زد میں جینا نسبتاً آسان ہے
زندگی کی زلف تو مشکل سے سلجھائی گئی

دیر تک چھنتی رہی دیوار و در سے روشنی
محفلِ زنداں میں جتنی بار سجائی گئی

اتنی ہی نیّر ہے بس میرے سفر کی داستاں
گھر جو لوٹا پاؤں میں زنجیر پہنائی گئی

ناخواستہ جب آپ نے دل توڑ دیا ہے
پھر کس کے سہارے پہ مجھے چھوڑ دیا ہے

اے شمعِ وفا! کچھ تجھے احساس تو ہوگا
کس حال میں پروانے نے دم توڑ دیا ہے

اب تک بھی وہیں پر ہے مری زندگی اے دوست
جس رہ میں ترے غم نے مجھے چھوڑ دیا ہے

چلتی ہے یہاں سانس بھی گھبرائی ہوئی سی
اے دوست! کہاں تو نے مجھے چھوڑ دیا ہے

کل تک بھی جسے دعوئ عیسیٰ نفسی تھا
دل اُس نے بہ عنوانِ وفا توڑ دیا ہے

اتنا نہ ہو دلگیر تو اے جانِ تمنا
کچھ سوچ کے ہی ساتھ ترا چھوڑ دیا ہے

اے فطرتِ غم تیری ہی تسکین کی خاطر
نیّر نے تمناؤں کا دل توڑ دیا ہے

یہ ہم بھی جانتے ہیں راہ گیر کتنے تھے
مگر تمہاری طرح بے ضمیر کتنے تھے

لٹے کچھ ایسے کہ کشکول ہو گئے خالی
قلندروں میں بھی دل کے امیر کتنے تھے

صبا تو پہلے ہی خوشبو بدن کی لے کے اڑی
تمہاری زلفوں کے ہم ہیں اسیر کتنے تھے

کیا جنھوں نے یہاں خانقاہ پر قبضہ
ہماری طرح کے ان میں فقیر کتنے تھے

جو لوگ قتل کی سازش میں کل شریک رہے
ہمارے شہر کے اُن میں وزیر کتنے تھے

وہ سب کے سب کئی رشتوں میں بٹ گئے نیّر
تمہارے ساتھ بظاہر سفیر کتنے تھے

تشنگی جب کبھی مے خانے میں لے آتی ہے
آپ کی پیاس مرے ہونٹوں پہ جم جاتی ہے

آپ نے اتنے کچھ احسان کیے ہیں مجھ پر
زندگی آنکھ ملاتے ہوئے شرماتی ہے

یادِ محبوب کو اللہ سلامت رکھے
خلوتِ دل کے ہر اک گوشے کو مہکاتی ہے

جب بھی اس سمت سے گزرے ہے نسیمِ سحری
میرے آنگن میں بھی کچھ دیر ٹھہر جاتی ہے

یا برہنہ ہے مری زیست تو حیرت کیوں ہے
زندگی خانہ بدوشوں کو بھی گھر لاتی ہے

وقتِ رخصت تری آنکھوں کی زباں پڑھ لیگا
میں اگر چپ بھی رہوں دل بڑا جذباتی ہے

زندگی، دشت نوردوں ہی میں خوش تھی نیرؔ
اپنے گھر لوٹ کے وہ اب بھی پچھتاتی ہے

وفا کے پھول تم گورِ غریباں پر چڑھا دینا
اگر یہ بھی نہ ہو ممکن تو کچھ آنسو بہا دینا

جہاں غم کے دُھندلکے ہوں چراغِ اشک کافی ہیں
جہاں گہرا اندھیرا ہو، وہاں تم دل جلا دینا

تمہاری بزم کے آداب سے واقف ہوں میں پھر بھی
مٹا سکتے ہو گر نقشِ وفا تم خود مٹا دینا

مسیحائی کا دعویٰ ہو تو میری بات بھی سن لو
مریضِ عشق کو اچھا ہے دامن کی ہوا دینا

بہت چاہا تمہاری یاد دل سے جا نہیں سکتی
اگر تم بھول سکتے ہو تو پھر مجھ کو بھلا دینا

تمہارے بعد میری زندگی میں اب رہا کیا ہے
چراغِ دل ہے روشن تم سلیقے سے بجھا دینا

بھری محفل میں رسوائی کا ڈر ہے پھر بھی اے نیرؔ
اگر ہونٹوں پہ پابندی ہے آنکھوں سے سنا دینا

داغِ دل چمکا کریں گے روشنی کم کم سہی
پھول ہنستے ہی رہیں گے تازگی کم کم سہی

کاسۂ دل آخرِ شب خون سے بھر جائے گا
انتظارِ دوست، تیرا غم ابھی کم کم سہی

اس کے جلنے میں ہے شامل شمع کے دل کا گداز
ایک پروانے کو اپنی آگہی کم کم سہی

گل ہے گا ہے ہی سہی کھلتے تو ہیں شاداب ہونٹ
میری حالت پر توجہ آپ کی کم کم سہی

مانگ لوں گا تیرے زر افشاں تبسم سے ضیا
زندگی کے راستے میں روشنی کم کم سہی

نشۂ مے سے نہیں کم، نشۂ زندگانی کا نشہ
پیاس بڑھتی ہی رہے گی تشنگی کم کم سہی

بہتے ہوئے دریا میں کنول چھوڑ رہا ہوں
کچھ دن کے لیے شہرِ غزل چھوڑ رہا ہوں

حصّے میں مرے آئی ہے جمنا کی اُداسی
میں تیرے لیے تاج محل چھوڑ رہا ہوں

رکھنا تو بدن اپنا سمیٹے ہوئے یوں ہی
تیرے لیے گزرا ہوا کل چھوڑ رہا ہوں

کچھ اور بڑھا دیجئے مرے قید کی میعاد
گھر آج نہیں آپ کا کل چھوڑ رہا ہوں

دم گھُٹنے لگا بند فضا میں مرا نیّرؔ!
کُٹیا کے لیے راج محل چھوڑ رہا ہوں

راکھ کے ڈھیر میں گر ایک بھی چنگاری ہے
آنے والے کئی برسوں کے لیے بھاری ہے

آپ ہر روز بدلتے رہیں کتنے ہی لباس
پیرہن آپ کا خوشبو سے مگر عاری ہے

پیار پایا ہے تو نفرت بھی یہاں سہہ لوں گا
میرے محبوب کی ہر ایک ادا پیاری ہے

کھٹکھٹاؤں گا نہ انصاف کا دروازہ ابھی
ایک ظالم کی ابھی مشقِ ستم جاری ہے

کس طرح ترکِ تعلق کا گلہ تجھ سے کروں
تیرے اندازِ تغافل میں بھی دلداری ہے

خانقاہوں کی وہ چوکھٹ سے اٹھا ہے تیرؔ
جس کی ٹھوکر میں ہر اِک دور کی سرداری ہے

پھر میں اک انجمن میں ہوں نزدیک سے گزرا ہے کون
اِس طرح اپنے مکاں کو چھوڑ کر جاتا ہے کون

روشنی بن کر پسِ دیوارِ شب گر تم نہ تھے
موم بن کر شہر کی راتوں میں اب جلتا ہے کون

پھر نئے موسم کے تازہ پھول ہاتھوں میں لیے
دل کے دروازے پہ دستک آج پھر دیتا ہے کون

دوش پر بادِ صبا کے اُڑنے والے دیکھ لے
نقشِ پا بن کر تری راہوں میں اب بیٹھا ہے کون

تشنہ لب، تیشہ بہ کف کب تک رہوں گا دوستو!
مجھ کو خود میں ڈھونڈنے والا یہاں ایسا ہے کون

راہ تکتے تکتے تیرا! ہو گئیں پلکیں سفید
چلئے دیکھیں صبح کے ہمراہ گھر آیا ہے کون

کتنے شاداب لبوں پر ہے فغاں میرے بعد
بزم کی بزم ہوئی اشک فشاں میرے بعد

کون دیوانہ ہے کیا نام ہے اُس کا یارو
لے اڑا کون مری طرزِ فغاں میرے بعد

دوستو! پاسِ وفا، عظمتِ دل کچھ بھی نہیں
کتنی ارزاں ہوئی ہر جنسِ گراں میرے بعد

درد کی شمعیں ابھی خیر سے جلتی ہیں ندیم
شہر کی گلیوں سے اُٹھے گا دھواں میرے بعد

میرے آنسو جو گرے تھے کبھی جگنو کی طرح
شب کی پلکوں پہ رہے رقص کناں میرے بعد

آج بھی پیار کی راہوں میں اجالے ہیں مگر
اور بھی ابھریں گے قدموں کے نشاں میرے بعد

گھل رہا ہوں میں فقط ایک ہی غم سے نیّر
وہ بھی ہو جائیں نہ رسوائے جہاں میرے بعد

بات جب چھڑ گئی غریبوں کی
اُڑ گئی نیند خوش نصیبوں کی

ہم سے اے زندگی کے دیوانو
آبرو بڑھ گئی صلیبوں کی

عمر بھر خونِ دل جلاتے ہیں
ہے یہی زندگی ادیبوں کی

خود ہی روتے ہیں خود ہی ہنستے ہیں
کیا حکایت ہے غم نصیبوں کی

کب کا بیمارِ غم ہوا رخصت
اب ضرورت نہیں طبیبوں کی

دردِ دل کس سے اب کہیں نیّر
کون سنتا ہے غم نصیبوں کی

آپ کے حُسن نزاکت کی کوئی حد ہو گی
پیکرِ حُسن کہوں گا تو خوشامد ہو گی

ہر قدم پر نظر آتی ہیں لہو کی بوندیں
ہو نہ ہو شہرِ وفا کی یہی سرحد ہو گی

میری آنکھوں میں ذرا جھانک کے دیکھو تو سہی
کوئی کھوئی ہوئی شے پھر بھی برآمد ہو گی

تیری محفل کی روایات ہی کچھ ایسی ہیں
بات جب میری وفا کی ہے تو وہ رد ہو گی

گُل نہ ہوں پاس تو اشکوں کے ہی کچھ پھول سہی
اِس عنایت سے بھی کچھ رونقِ مرقد ہو گی

کون دُہرائے گا کانٹوں کی کہانی نیّر!
اپنی قسمت میں اگر پھولوں کی مسند ہو گی

ہر قدم ایک منزلِ آغاز
آرزوؤں کا سلسلہ ہے دراز

تو بہر رنگ ہے حیات نواز
اے غمِ عشق تیری عمر دراز

زخمِ دل اب بھی مسکراتے ہیں
اُن کی یادیں ہیں کتنی درد نواز

فرشِ گُل ہو کہ دامنِ صحرا
ہے مسافر کا ایک ہی انداز

درد کی لے بھی ہو چلی مدّھم
سازِ دل ہو نہ جائے بے آواز

دھڑکنیں دل کی مانگنے والے
ہے کوئی تیری اِس طلب کا جواز

جانِ نغمہ! ذرا صدا دینا
کب سے نیّرؔ ہے گوش بر آواز

اُن کی تعریف میں تضحیک کا پہلو تو نہیں
اے غمِ عشق ! کہیں دشمنِ جاں تُو تو نہیں

لوگ کہتے ہیں جسے دوستو جمنا کا سہاگ
تاج کی آنکھ سے ٹپکا ہوا آنسو تو نہیں

صحنِ گلشن کی دل آویز فضاؤں میں کہیں
تیرے ہونٹوں کی مہکتی ہوئی خوشبو تو نہیں

اتنی روشن تو نہ تھی راہِ وفا پہلے کبھی
وادیٔ دل میں کسی یاد کا جگنو تو نہیں

ضبط کی منزلِ آخر پہ رُکے ہیں دو دل
ایسے عالم میں بھی احساسِ من و تُو تو نہیں

بھینی بھینی سی ہے خوشبو سرِ محفل نیّرؔ !
پھول کلیوں سے وہ لپٹے ہوئے بازو تو نہیں

ہیں سہمے سہمے سے سب لوگ، زندگی ہے کہاں
بتایئے مری بستی میں روشنی ہے کہاں

فضا میں جلتے گھروں کی ہے راکھ بکھری ہوئی
ہمارے ہونٹوں پہ پہلی سی اب ہنسی ہے کہاں

تمام بند ہیں دروازے کس پہ دستک دوں
پڑوسیوں میں بھی وہ ربطِ باہمی ہے کہاں

تم اب بھی ذہنی تحفظ کے ساتھ ملتے ہو
خلوص تو ہے مگر رسمِ دوستی ہے کہاں

وہ جس کے خون سے زخمی بدن میں جان آئی
میں کب سے ڈھونڈ رہا ہوں وہ اجنبی ہے کہاں

روایتاً یہاں ملتے ہیں دوستوں کی طرح
ابھی تو ہم میں کھلی دشمنی ہوئی ہے کہاں

وہ سامنے ہے مکاں خود ہی جائزہ لیجے
سلوکِ دوست میں نیّر! کمی ہوئی ہے کہاں

جیون بھر کی آس دلا کر تم نے چھوڑا میرا ہات
تم ہی کہو اب کون ہے ایسا جس سے کہوں میں دل کی بات

میرے ہاتھ بھی خالی کب تھے تم نے خود ہی بڑھایا ہات
تم سے پنہاں کب تھے ساتھی! جو کچھ تھے میرے حالات

صدیوں تک افسانے بنیں گے آج کے ایک اک لمحے کے
آتے ہو تو پاس ہی بیٹھو ٹھہر بھی جاؤ رات کی رات

بھیگا بھیگا جسم تمہارا، لرزاں لرزاں لب رخسار
یاد مجھے آتی ہے اب بھی ہائے وہی برسات کی رات

پھول سے آنسو زینتِ شبنم، آنسو اپنے پونچھو بھی
غم سہنے اک عمر پڑی ہے، تھوڑی ہے خوشیوں کی حیات

پیار کی قیمت اتنی ارزاں، کوچہ کوچہ رسوائی
تم ہی کہو اب شہرِ غزل میں اتنے کہاں ہم خوش اوقات

کھل کے کہو نزدیکِ رگِ جاں کیا وہ گلِ تازہ تو نہیں
کس کے لیے کہتے ہو نیّر! ایسے درد بھرے نغمات

صدیوں کا یہ جھگڑا ہے آپس میں ملا دیجے
بارش کا ہواؤں سے سمجھوتہ کرا دیجے

پھر آپ کی چوکھٹ پہ اک پل بھی نہ ٹھہروں گا
مجھ کو مرے ماضی سے اک بار ملا دیجے

خود غور سے پڑھ لیجے احباب کے چہروں کو
دشمن کی طرح ہوں تو رستے سے ہٹا دیجے

سمجھوتے کی منزل ہے ملنے سے تامّل کیوں
دل صاف اگر ہے تو پھر ہاتھ بڑھا دیجے

میں دخل نہیں دوں گا جب آپ کی مرضی ہے
دل ٹوٹ گیا ہو تو آئینہ بنا دیجے

بدلے ہوئے موسم کا ہم کو بھی ہو اندازہ
روٹھی ہوئی کلیوں کو شبنم سے ملا دیجے

تہذیبِ نظر مجھ کو ورثے میں ملی نیّر!
گستاخ نظر ہوں تو محفل سے اٹھا دیجے

شکستہ دل کی میں پہلی صدا ہوں
تری تنہائیوں میں گونجتا ہوں

کم از کم تم نہ پوچھو مجھ سے کیا ہوں
وفا کا نامکمل حادثہ ہوں

یہاں تو ایک بھی اپنا نہیں ہے
یہ کس میلے میں آ کر کھو گیا ہوں

بہت پہلے سُنی تھی کوئی آواز
اُسی لہجے کو اب تک ڈھونڈتا ہوں

تبسّم تم نے پایا میں نے آنسو
غزل کہلاؤ تم میں مرثیہ ہوں

"گلِ تازہ" ہے ہر زخمِ تمنّا
محبت کو دعائیں دے رہا ہوں

کسی سے کیا شکایت ہو گی نیّر
میں سب کو شہر میں پہچانتا ہوں

شعر کہتا ہوں ہمیشہ ہٹ کے طرزِ عام سے
ہر غزل کی ابتدا کرتا ہوں تیرے نام سے

غم شناسوں کے مسائل بھی سمجھنا ہے ہمیں
گفتگو ہوگی کسی دن گردشِ ایام سے

آپ سے ہم مطمئن تھے دشمنی جب تک رہی
اب تو دل گھبرا رہا ہے دوستی کے نام سے

تہمتِ دیوانگی کس گھر سے ہو کر آئی ہے
پارسائی زد میں آئی پیار کے الزام سے

کاسۂ دریوزہ دے کر اہلِ فن کے ہاتھ میں
زندگی سوئی ہوئی ہے کس قدر آرام سے

مجرموں کی طرح ہم کب تک پسِ پردہ رہیں
کب تلک جیتے رہیں ہم مصلحت کے نام سے

رقصِ پروانہ پہ رہتی ہے یہاں سب کی نظر
کس کو ہمدردی ہے نیرؔ شمع کے انجام سے

نظر بچا کے مری چشمِ تر میں رہتی ہے
وہ ایک پیاس جو پہلی نظر میں رہتی ہے

ترے بدن کی مہک جو کسی بھی گُل میں نہیں
کبھی کبھی وہ نسیمِ سحر میں رہتی ہے

کیا تھا قتل جسے حادثوں نے قسطوں میں
وہ ایک شام بھی نورِ سحر میں رہتی ہے

اکیلا کب رہا ترکِ وطن کے بعد بھی میں
تمہاری یاد ہمیشہ سفر میں رہتی ہے

تمام عمر کٹی اپنی وضع داری میں
انا تو صرف فقیروں کے گھر میں رہتی ہے

قلندروں کی رفاقت میں مل گئی نیّر!
وہ اک خوشی جو غمِ معتبر میں رہتی ہے

نسیمِ صبح! تیرا مرثیہ ہوں
میں پھولوں کی طرح بکھرا ہوا ہوں

شکستہ ساز ہوں درد آشنا ہوں
کسی ٹوٹے ہوئے دل کی صدا ہوں

مجھے تم سطحِ دریا پر نہ ڈھونڈو
بہت اونچی چٹانوں سے گرا ہوں

خود اپنی سانس بھی مجھ پر گراں ہے
نہ جانے کن گناہوں کی سزا ہوں

اندھیروں سے نکل کر مجھ کو دیکھو
کہ میں بھی روشنی کا سلسلہ ہوں

جہاں چھوڑا تھا مجھ کو زندگی نے
ابھی تک اُس دوراہے پر کھڑا ہوں

مجھے کیا سوزِ پروانہ سے نسبت
میں اپنی آگ میں خود جل رہا ہوں

جب کبھی اپنی چتا میں دولہنیں جل جائیں گی
روپ جیسی دیویاں تاریخ کو دُہرائیں گی

مصلحت کو چھوڑیئے گھر کی حفاظت کیجئے
چھت گری ہے آج تو دیواریں کل گر جائیں گی

صبح و شام اب آسمانوں کی طرف دیکھا کرو
ہے دُعاؤں میں اثر تو جھولیاں بھر جائیں گی

انتظارِ خضر میں بیٹھے رہو گے کب تلک
گھر سے نکلو گے تو گھر تک منزلیں خود آئیں گی

حُسنِ یوسف کو زلیخا کی نظر بھی چاہیئے
ورنہ اک جلوے میں ساری انگلیاں کٹ جائیں گی

سر جھکائے اپنی ماں کے پاؤں چھونے کے لیے
اپنے گھر اک دن نئی نسلیں پلٹ کر آئیں گی

وہ بھی دن آئے گا نیّر! چشمِ پُر نم کے لیے
صبح کی پُروائیاں خاکِ حرم لے آئیں گی

کچھ حادثہ ایسا ہے کہ دل ٹوٹ رہا ہے
پھر آئینہ ہاتھوں سے مرے چھوٹ رہا ہے

مہمان نوازی میں کمی رہ گئی شاید
گھر میں جسے رکھا وہی گھر لوٹ رہا ہے

ہم آپ کے اتنے بھی گنہ گار نہیں ہیں
کیوں سلسلۂ دیر و حرم ٹوٹ رہا ہے

تنہائیاں کیوں اتنی سمٹنے لگیں میری
لگتا ہے کہ پھر ساتھ ترا چھوٹ رہا ہے

*

احباب کی سازش تھی کہ سنبھلا نہیں اب تک
کیوں رشتۂ دیرینہ پھر اب ٹوٹ رہا ہے

صحرا میں کچھ اس طرح سے تم آ گئے نیر!
[illegible] رہا ہے

ایک مدت سے سمیٹے ہوئے بستر اپنا
سر جھکائے ہوئے ٹھہرا ہے مسافر اپنا

دل یہ کہتا ہے یہاں کوئی تو آیا ہوگا
اتنا روشن تو نہ تھا پہلے کبھی گھر اپنا

غم نہیں اس کا کہ آتے ہیں کدھر سے پتھر
ہم تو رکھتے ہیں ہمیشہ ہی کھلا سر اپنا

کیسے حالات میں بچھڑے تھے یہاں ہم دونوں
تذکرہ ہوتا ہے اس شہر میں اکثر اپنا

زندگی ساری کٹی خانہ بدوشوں کی طرح
انتظار اب بھی ہوا کرتا ہے اکثر اپنا

کتنے ہی پھول کھلے صحنِ چمن میں نیر
پھر بھی اس بھیڑ میں تنہا ہے گلِ تر اپنا

خدا کرے کہ وہ جب تک بھی محوِ خواب رہے
ہمیشہ ہاتھوں میں اُس کے مری کتاب رہے

کسی کا جب بھی یہاں آپ فردِ جُرم لکھیں
ہمارے جُرمِ تمنّا کا بھی حساب رہے

مری زمین اندھیروں سے کب رہی خالی
سحر فروش ہمیشہ ہی دستیاب رہے

تمہاری بولتی آنکھوں میں تھے سوال کئی
نظر جو تم سے ملی ہم تو لاجواب رہے

تمہارے چہرے کی تحریر کیسے پڑھ لوں گا
حسین چہرے پہ جب تک کہ یہ نقاب رہے

تمام عمر رہے آپ الجھنوں کا شکار
جو بے نیاز تھے نیّر! وہ کامیاب رہے

آپ کیوں کہتے ہیں قاتل کو مسیحا کہیئے
کون ہے شہر میں اب خون کا پیاسا کہیئے

ایک سے چہرے ہر اک گھر میں نظر آتے ہیں
ایسے عالم میں کریں کس پہ بھروسہ کہیئے

آپ تو اونچی چٹانوں پہ نظر رکھتے ہیں
کس نے گرتے ہوئے لوگوں کو سنبھالا کہیئے

کب تلک ٹھہر دل میں ٹوٹی ہوئی دیوار کے پاس
کس کے کام آیا ہے دیوار کا سایہ کہیئے

یوں تو سب ملتے ہیں بدلے ہوئے موسم کی طرح
کس نے مجھ جیسا تمہیں ٹوٹ کے چاہا کہیئے

خاک ہاتھوں میں لیے اپنے وطن کی نیرؔ!
کس نے اب جلتے ہوئے گھر سے پکارا کہیئے

ہم اہلِ درد ہیں، تم، ہم کو بے وفا نہ کہو
برادری کو ہماری کبھی بُرا نہ کہو

بدن بھگونے کو بس ایک بوند کافی ہے
ٹپک رہا ہے اگر چھت تو آسرا نہ کہو

ضمیرِ زندہ علامت ہے تشنہ کامی کی
شکستگی کو مری، غم کا سلسلہ نہ کہو

ابھی بنے ہی کہاں ہیں زمیں کا حصّہ
اُبھر کے آئیں تو تم اُن کو نقشِ پا نہ کہو

بس ایک رات تو مہلت دو سوچنے کی مجھے
تم اپنے فیصلے کو میرا فیصلہ نہ کہو

لگی جو آگ تو پتھر پگھلنے لگتے ہیں
نہ ٹوٹے دل جو کسی کا تو آئینہ نہ کہو

ہے باقی اب بھی تعارف کا سلسلہ نیّر!
مجھے پرکھنے سے پہلے ہی بے وفا نہ کہو

رہزنوں سے ربط ہے تو راہبر کو چھوڑ دے
فاصلے جب بھی سمٹ جائیں تو گھر کو چھوڑ دے

کون جانے دوست! ارمانوں کی منزل ہے کہاں
یاد آنے کے لیے رختِ سفر کو چھوڑ دے

تشنگی کا حق ادا ہو پیاس بھی بجھتی رہے
میرے دامن کے لیے تو چشمِ تر کو چھوڑ دے

میں فریبِ دوستی کی زد میں تنہا رہ گیا
یہ نہیں کہتا کہ تو بھی ہم سفر کو چھوڑ دے

اِک نہ اِک دن اپنے گھر گھبرا کے خود ہی آئے گی
پھر بھٹکنے کے لیے پہلی نظر کو چھوڑ دے

گفتگو کے فن سے وہ اچھی طرح واقف نہیں
تیرا غصہ میں سہوں گا نامہ بر کو چھوڑ دے

زندگی کا یہ سفر نیّر! یوں ہی جاری رہے
جب بھی تیرا دم گھٹے دیوار و در کو چھوڑ دے

بچھڑنا تیرا مجھے عمر بھر رلائے گا
یہ اور بات کہ تو مجھ کو چھوڑ جائے گا

تمام رسم کی زنجیریں توڑ کر مجھ سے
تمہارے بعد یہاں کون ملنے آئے گا

یہ کیا ستم ہے کہ بادِ صبا بھی روٹھ گئی
پیامِ دوست مرے پاس کون لائے گا

ہر ایک ورق پہ ہوں گر تیری انگلیوں کے نشاں
ہر اک غزل میں ترا حسن ابھر کے آئے گا

اسی طرح سے جو خلوت نشیں رہو گے تم
تمہاری خوشبو سے کمرہ مہکتا جائے گا

میں ایک پل بھی رکوں گا جہاں بھی چلتے ہوئے
ترا خیال وہیں چھاؤں بن کے آئے گا

ہمارے بیچ جو خوشبو کا ایک رشتہ ہے
اس ایک رشتے کو نیّر ترا نبھائے گا

زندگی کم ہے بہت تم کو بھلانے کے لیے
کون آیا ہے مجھے چھوڑ کے جانے کے لیے

اِتنے رسوا ہوئے ہم، کوئی بھی چوکھٹ نہ بچی
ہم نے کیا کیا نہ کیا آپ کو پانے کے لیے

زندگی بھر جو یہاں فرشِ نظر بن کے رہا
تم نے چھوڑا ہے اُسے ٹھوکریں کھانے کیلئے

ایک دو دن نہیں برسوں سے ریاضت کی ہے
تیری آواز میں آواز ملانے کے لیے

زندگی ہوگئی اب خانہ بدوشوں کی طرح
اب تو آجاؤ مرے گھر کو بسانے کے لیے

کس طرح عمر کٹی نیرؔ تاباں سے کہو
اپنے روٹھے ہوئے ساتھی کو منانے کیلئے

گھُٹ جائے گا دم میرا اگر کچھ نہ کہو گے
منہ پھیر کے کب تک یوں ہی تم رُوٹھے رہو گے

تھوڑا بھی ہو جو تم میں بچھڑنے کا سلیقہ
تا عمر کبھی تم یہاں تنہا نہ رہو گے

اِس طرح اگر ڈھلتا رہا صبح کا آنچل
ڈھلتے ہوئے سورج کی طرح تم بھی ڈھلو گے

پھر کس سے ہو اِن تازہ جزیروں کی حفاظت
حالات کے سیلاب میں گر تم بھی بہو گے

اک تار بھی ثابت کبھی تن پر نہ رہے گا
تم میری محبت پہ اگر طنز کرو گے

اوڑھے ہوئے نکلوں گا اُجالوں کی ردائیں
سائے کی طرح جب مرا تم پیچھا کرو گے

دل کہتا ہے نیّرؔ! کبھی تم اپنے قلم سے
تختی پہ مرے گھر کی مرا نام لکھو گے

پا بہ جولاں شہر میں اُس شخص کو لائے گا کون
ایک دیوانے کے سر پہ تاج پہنائے گا کون

زندگی کے درد کو تنہا سمجھنے کے لیے
رات کے شانوں پہ اپنی زلف بکھرائے گا کون

خونِ دل سے لکھ رہا ہوں زندگی کا مرثیہ
ایسی حالت میں مجھے اب چھوڑ کر جائے گا کون

کس بلندی پر میں رہتا ہوں تمہیں معلوم ہے
سطح بیں لوگوں کو اتنی بات سمجھائے گا کون

زندگانی پھر ترے آئینہ خانوں کے لیے
پتھروں کے شہر سے اب جا کے ٹکرائے گا کون

دل کی دھڑکن دوست کی مانند میرے ساتھ ہے
ایسی باتوں سے مجھے اب پھر سے بہلائے گا کون

یوں تو راس آئی ہے نیّر! تازہ موسم کی ہوا
پیار کی خوشبو سے میرے گھر کو مہکائے گا کون

ابھی ہے آس ترا انتظار کر لوں گا
جو تو نہیں تری آہٹ سے پیار کر لوں گا

میں جلد آؤں گا ساحل پہ گفتگو کے لیے
یقین کیجئے یہ دریا بھی پار کر لوں گا

چھپاؤں کیسے میں اب اضطراب آنکھوں کا
خموشی جبر سہی، اختیار کر لوں گا

سحر کے ساتھ ہمیشہ کی روشنی کے لیے
نگاہِ دوست پہ بھی انحصار کر لوں گا

وفورِ شوق میں پابوسی جرم ہے تو رہے
گناہ گاروں میں خود کو شمار کر لوں گا

میں خود بھی اُس کے قبیلے کا فرد ہوں نیّر

کیا جانے اب کے رت یہاں کیا کام کر گئی
چادر نئی بہار کے سر سے اتر گئی

تم اک لکیر کھینچ کے ہی مطمئن رہے
حدِ تعینات سے آگے نظر گئی

پھولوں کی تازگی کا جہاں ذکر آگیا
پہلو بچا کے سب سے نسیمِ سحر گئی

یہ کیسی بھول تجھ سے ہوئی اے نسیمِ صبح
آنگن میں کس کے جانا تھا تو کس کے گھر گئی

کیوں میری زندگانی میں پھر آگئے ہو تم
میری حیاتِ تازہ تو کب کے بکھر گئی

تم ساتھ تھے تو زیست تھی پھولوں کے درمیاں
جب تم نہیں تو زیست نہ جانے کدھر گئی

نیّر! مرے خلوص کا یہ بھی ہے سانحہ
اب کے بھی خالی ہاتھ دعائے سحر گئی

کس تربیتِ خوش نگہی کا یہ صلہ ہے
اعزاز مری فکر و نظر کو جو ملا ہے

احساس تری آبلہ پائی کا ہوا ہے
جب بھی مرے ہمراہ تو رک رک کے چلا ہے

مہکے ہوئے گلشن میں گلِ تر کی طرح سے
اک نام ہمیشہ مرے ہونٹوں پہ رہا ہے

اب جس کے گلے میں ہے یہاں پھولوں کی مالا
وہ شخص بھی اکثر یہاں کانٹوں پہ چلا ہے

شاہینِ نظر، تیشہ بہ کف وہ سرِ مغرور
ہم جیسے فقیروں کے گھرانے میں ملا ہے

گلنار نہ تھا صحنِ گلستاں کبھی اتنا
یہ کونسا کانٹا ترے تلووں میں چبھا ہے

میں خود بھی ہوں پیاسا یہ بتا دے مجھے نیّر
جز تشنگیِ لب، تری تحریر میں کیا ہے

تمہاری ہم نشینی کا زمانہ یاد آتا ہے
تمنّا رقص کرتی ہے، تخیّل گنگناتا ہے

عموماً آخرِ شب کا دامن بھیگ جاتا ہے
دلِ دیوانہ کس کی یاد میں آنسو بہاتا ہے

تلاطم خیز طوفاں ہو کہ آثارِ لبِ ساحل
فضائے بے یقینی میں سفینہ ڈوب جاتا ہے

حوادث خوبصورت ہوں کہ ملتے ہوں اذیت کے
زمانہ رفتہ رفتہ اُن کو اک دن بھول جاتا ہے

چمن زاروں کی آزادی پہ جب بھی آنچ آجائے
وہاں احساس خودداری نشیمن خود جلاتا ہے

وہیں سے راستہ پاتی ہے دنیا شہرِ دانش کا
نشانِ پا جہاں دیوانہ قصداً چھوڑ جاتا ہے

نہ جانے کتنی شمعیں جلتے جلتے بجھ گئیں نیّر
مری پلکوں پہ اک آنسو ابھی تک جگمگاتا ہے

آ جاؤ قریبِ دل، آ ؤ ! یہ رات گئی تو بات گئی
جو کچھ بھی ہو کہنا کہہ جاؤ یہ رات گئی تو بات گئی

ہے آخرِ شب اے دیوانو ! یہ رسمِ وفا ہے پروانو
اب شمع کی لو پہ جل جاؤ یہ رات گئی تو بات گئی

پھر دید کی راتیں ہوں کہ نہ ہوں پھر پیار کی باتیں ہوں کہ نہ ہوں
آئے ہو تو کچھ دم رک جاؤ یہ رات گئی تو بات گئی

تم شمع بنو یا پروانہ ، دونوں کا ہے مقصد جل جانا
شب بیت نہ جائے جل جاؤ یہ رات گئی تو بات گئی

تم سے بھی بہت کچھ کہنا ہے ہم کو بھی بہت کچھ سننا ہے
نزدیکِ رگِ جاں آ جاؤ یہ رات گئی تو بات گئی

پھر چاکِ جگر سل جانے دو ، پھر دل کا کنول کھل جانے دو
تم یوں ہی تبسم فرماؤ یہ رات گئی تو بات گئی

شمعوں کی لویں کم ہونے لگیں ، مدھم ہیں ستارے اے نیر
اب دامنِ دل کو سلگاؤ یہ رات گئی تو بات گئی

شعلوں میں آرزو کے جلنا سنبھل سنبھل کے
راہِ وفا میں ساتھی! چلنا سنبھل سنبھل کے

اے شامِ غم کے ساتھی! اے ہم نفس پتنگے
رسوا نہ ہو محبت چلنا سنبھل سنبھل کے

بھونروں کی انجمن میں پھولوں کے تذکرے ہیں
اے موجِ نکہتِ گُل! چلنا سنبھل سنبھل کے

اے اشکِ دیدۂ نم، شبنم مزاج بن جا
دامن جلے نہ اُن کا چلنا سنبھل سنبھل کے

ممکن ہے ہوگا یہ بھی پھر صبحِ نو کا دھوکا
آنکھوں کو اپنے ساقی ملنا سنبھل سنبھل کے

دامن کہیں وفا کا یک لخت جل نہ جائے
محفل میں اُن کی نیرؔ چلنا سنبھل سنبھل کے

چراغ راہ میں ہم نے جلا دیئے کہ نہیں
حسین، نقشِ کفِ پا سجا دیئے کہ نہیں

قدم تمہارے اندھیروں نے جب بھی روک لیے
تو ہم نے راہ میں جگنو اڑا دیئے کہ نہیں

بنا کے اپنے حسین نرم نرم ہاتھوں سے
گھروندے پیار کے تم نے مٹا دیئے کہ نہیں

نسیمِ صبح سے پہلے ہی چشمِ شبنم نے
گلوں کے حال پہ آنسو بہا دیئے کہ نہیں

کوئی بتائے کہ صحرا نشیں کے دامن پر
بہارِ تازہ نے آنسو بہا دیئے کہ نہیں

سحر کے ساتھ ہی اے نیّرِ حزیں ہم نے
جلے چراغِ تمنا بجھا دیئے کہ نہیں

ہوا ختم اُن کا کرم دھیرے دھیرے
ملے ساری دنیا کے غم دھیرے دھیرے

کہیں پردۂ شب پہ آنچ آنہ جائے
سلگتے ہیں ہم شامِ غم دھیرے دھیرے

بہت ناز تھا اُن کو بھی ضبطِ غم پر
کھُلا وقتِ رخصت بھرم دھیرے دھیرے

شبِ غم کے احوال ہم سے نہ پوچھو
سنائے گی خود چشمِ نم دھیرے دھیرے

وفا کو سرافراز کرنے کی خاطر
ہوئے کتنے ہی سر قلم دھیرے دھیرے

سہاروں کو آواز دیں گے نہ یارو
سنبھل جائیں گے خود ہی ہم دھیرے دھیرے

دھواں سا نکلتا ہے سینے سے نیّرؔ
سلگنے لگی چشمِ نم دھیرے دھیرے

ایک جھونکا بھی شمیم زلف کا آیا نہیں
گلستانِ دل کا کوئی پھول بھی تازہ نہیں

اس قدر کھل کر نہ ہنستے آپ حالت پر مری
آپ کو شاید مرے زخموں کا اندازہ نہیں

میرے ماضی پر اُچٹتی سی نظر ڈالی مگر
کیسے ہو، رہتے کہاں ہو تم نے یہ پوچھا نہیں

بے خبر انجام سے ہو کر تم آئے ہو مگر
کل زمانہ کیا کہے گا تم نے یہ سوچا نہیں

آئے ہو تو روبرو بیٹھو گھڑی بھر کے لیے
آنکھ بھر کر آج تک میں نے تمہیں دیکھا نہیں

تہمتِ مستی نہیں ہے سُرخ آنکھوں پر مری
رات بھر جاگا ہوا ہوں ایک پل سویا نہیں

دردِ دل نیّر سنا کر فائدہ کچھ بھی نہیں
دیکھ لو اس بزم میں کوئی بھی غم دیدہ نہیں

لہجے کو نرم کیجیے کہ آہستہ بولیے
رسمِ وفا تو یہ ہے لبوں کو نہ کھولیے

لینا اگر ہے میری وفاؤں کا جائزہ
احساسِ غم کو دل کی ترازو میں تولیے

دوشیزۂ دل مہکتی فضاؤں میں رات بھر
اندیشۂ فراق میں جی بھر کے رولیے

رخسار و لب کی روشنی اپنی جگہ سہی
دنیا اندھیری ہوگئی آنکھیں تو کھولیے

صحنِ قفس میں بھول کے آئی ہے پھر بہار
انجام کچھ بھی ہو پرِ پرواز کھولیے

نیّر! خلوصِ دل کو کہیں ٹھیس لگ نہ جائے
دل ہے اُداس آج نہ کچھ ہم سے بولیے

میں جانتا ہوں کہ میں نے ہی دل دکھایا ہے
بہت دنوں سے تمہارا اداس چہرہ ہے

ابھر کے آئے ہیں پھر ذہن و دل پہ تازہ نقوش
نئی ہے چوٹ مگر سلسلہ پرانا ہے

وہ ایک چاند کہ ٹھنڈک ہے جس کا سارا وجود
کسے خبر تھی مرے گھر اترنے والا ہے

بہت دکھی ہو تو خود کو سمیٹ کر رکھنا
کوئی قریب سے ہو کر گزرنے والا ہے

حصارِ دیر و حرم سے نکل کے آیا ہوں
تمہیں بتاؤ کہاں مجھ کو سر جھکانا ہے

مرے بدن میں ہے سجدگی کی خوشبو مگر
انا پسند طبیعت، قلندرانہ ہے

کہیں ملے نہ ٹھکانا تو سوچ لو نیرا
اسی گلی میں ہی میرا غریب خانہ ہے

مدھم ہی سہی شمعیں جلائے ہوئے رکھنا
ہر وقت مرے گھر کو سجائے ہوئے رکھنا

بھیگی ہوئی پلکیں ہوں تو رسوائی کا ڈر ہے
اچھا ہے یہی نظریں جھکائے ہوئے رکھنا

پھولوں کا زمانہ ہو کہ پتھراؤ کا موسم
ہر حال میں تم سر کو اٹھائے ہوئے رکھنا

ایسا نہ ہو میں اُلٹے قدم لوٹ کے آؤں
آنسو ہوں تو پلکوں میں چھُپائے ہوئے رکھنا

تبدیلیٔ حالات کا کیا جانے اثر ہو
موسم سے نئے خود کو بچائے ہوئے رکھنا

خوشبو کا سفر، رُکنے نہ پائے کبھی نیرا
احساس کو ہر وقت جگائے ہوئے رکھنا

نیموں کو اپنے چھوڑ کے سب اپنے گھر گئے
جب فصلِ گُل کے جسم سے زیور اُتر گئے

خوشبو سہاگ رات کی جن سے تھی معتبر
وہ لمحے زندگی کے نہ جانے کدھر گئے

بے نام آہٹوں نے سہارا دیا ہمیں
ہم چلتے چلتے راہ میں جب بھی ٹھہر گئے

مانوس جتنے چہرے تھے سب اجنبی لگے
آئینے ٹوٹ ٹوٹ کے جب بھی بکھر گئے

تو بھی تھی میرے ساتھ بتا اے نسیمِ صبح
وہ کون تھے جو بزم سے با چشمِ تر گئے

تیری طلب نے دی یہی سوغاتِ گردِ راہ
ہم اپنے ساتھ لے کے یہ رختِ سفر گئے

چوکھٹ پہ اُن کی اک نئی پہچان کے لیے
نیّر کا نام لے کے کئی نامور گئے

کل شام سے پھر کوچۂ جاناں میں ملوں گا
خوشبو کی طرح زلفِ پریشاں میں ملوں گا

بعد اس کے کہاں ہوں گا مجھے خود نہیں معلوم
ہاں صبح تلک اپنے شبستاں میں ملوں گا

لیلیٰ سخن! تیری نگاہوں سے میں بچ کر
مجنوں کی طرح تارِ گریباں میں ملوں گا

رہنے دو ابھی تلخیٔ ایام کی زد میں
میں آخرِ شب، بزمِ رفیقاں میں ملوں گا

ہر وقت مجھے دوستو! صحرا میں نہ ڈھونڈو
میں آبلہ پا بن کے گلستاں میں ملوں گا

اِک لمبی جدائی کے لیے چھوڑ دو نیرؔ!
پھر اگلے برس جشنِ بہاراں میں ملوں گا

کب انتشار، شاملِ محفل نہیں رہا
موجوں کی زد میں کب کوئی ساحل نہیں رہا

ٹوٹا ہے دل کا آئینہ ترکِ وفا کے بعد
اب زندگی کے کوئی مقابل نہیں رہا

ارزاں تو اِس قدر نہ تھا انسان کا لہو
تم کہہ رہے تھے شہر میں قاتل نہیں رہا

دل، درد کا نقیب تھا لیکن تمہارے بعد
اب دل بھی اعتبار کے قابل نہیں رہا

رہزن سمجھ رہے ہیں مجھے اہلِ کارواں
میں جبکہ قافلہ میں بھی شامل نہیں رہا

تم مصلحت شناس تھے اُلجھن میں پڑ گئے
شاید میں دشمنی کے بھی قابل نہیں رہا

نیّر نظر شناس سہی پھر بھی دوستو!
تم سے نظر ملانے کے قابل نہیں رہا

یہ لہو کم تو نہ تھا جشن منانے کے لیے
امن و تہذیب کے ماتھے پہ لگانے کے لیے

آپ کے ہاتھوں سے بارود کی بو آتی ہے
آپ تو آئے تھے گلشن کو سجانے کے لیے

قاتلوں کو مرے لُٹنے سے تشفی نہ ہوی
پھر چلے آئے مرا گھر وہ جلانے کے لیے

کون کس بھیس میں پھرتا ہے خدا ہی جانے
لوگ ملتے ہیں یہاں رسم نبھانے کے لیے

پہلے ہم کو نظر انداز تو کر کے دیکھو
منتظر ہم بھی ہیں احساس دلانے کے لیے

اب بھی نیّر وہی مشکوک وفاداری ہے
ہم نے کیا کیا نہ کیا شہر بسانے کے لیے

جب مرے دل نے ترے قرب کو محسوس کیا
میرا ہر لمحۂ شاداب مہکتا ہی رہا

کب اکیلا میں رہا شہر کے سنّاٹے میں
میری تنہائی میں بھی سایۂ ہمسایہ رہا

میرے آنسو تری آنکھوں میں نظر آئے مگر
تیری بھیگی ہوی پلکوں کو کبھی چھو نہ سکا

زندگی! کل تیرا لہجہ نہ بدل جائے کہیں
اِس لیے ہونٹوں پہ میں نے ترے اک نام لکھا

گھر کے ہر گوشے میں سہمے ہوئے لمحوں کی طرح
تم نے کیا بات تھی کیوں خود کو چھپانا چاہا

زندگی تجھ کو منانے میں کہاں دیر ہوی
گزرے لمحات سے جب میں نے بھی سمجھوتہ کیا

ایک مانوس سی خوشبو نے قدم روک لیے
جب بھی نیّر نے تمھیں چھوڑ کے جانا چاہا

روز و شب مجھ سے اُلجھ کر مجھ سے ہی ملتا ہے کیوں
دلربا انداز تیرا اِس قدر پیارا ہے کیوں

عطر میں بھیگی ہوئی سانسوں کی خوشبو کی طرح
میرا ماضی شب کی چادر اوڑھ کر سوتا ہے کیوں

جب یہ سچ ہے کوئی آہٹ ہے نہ دستک کی صدا
دل کا دروازہ مگر اکثر کھُلا رہتا ہے کیوں

یوں بظاہر اس سے میرا کوئی بھی رشتہ نہیں
انتظار اکثر مجھے اُس شخص کا رہتا ہے کیوں

تھا جو شامِ غم کی نازک موڑ پر تنہا رفیق
اک چراغ ایسا بھی میرے گھر میں اب جلتا ہے کیوں

تم کو چھونے والا ہر اک لمحۂ عشرت نواز
میرے دل کی دھڑکنوں سے بدگماں رہتا ہے کیوں

ویسے سب کچھ ہے میسر پھر بھی نیّر! کس لیے
گھر مرا اکثر مجھے بے سائباں لگتا ہے کیوں

جسم گھائل کیے زہریلی فضا نے کتنے
خون میں اب کے نہائے ہیں گھرانے کتنے

اب کی برسات میں ہر سمت سے پتھر برسے
ٹوٹ کر بکھرے یہاں آئینہ خانے کتنے

ہم کو معلوم نہیں کس گلِ خنداں کے لیے
گھر اُجاڑے ہیں یہاں بادِ صبا نے کتنے

اپنے ہی سایہ سے اب خوف ہمیں لگتا ہے
خواب دیکھے تھے یہاں ہم نے سہانے کتنے

اگلے موسم کے نئے پھول ہی بتلادیں گے
موسمِ گل میں بھی پتھر تھے سرہانے کتنے

ایک دن اپنا بھی خود جائزہ لے لو نیّرؔ!
عقل کی زد میں ہیں ہم جیسے دِوانے کتنے

یہ ان کی گلی ہے بادِ صبا آہستہ گزر آہستہ گزر
یہ راہِ وفا ہے راہِ وفا آہستہ گزر آہستہ گزر

اے رہروِ الفت آ پہنچی وہ شہرِ نگاراں کی سرحد
آتی ہے شکستِ دل کی صدا آہستہ گزر آہستہ گزر

اے نکہتِ گل! اس محفل میں آزردہ نہ ہو آزردہ نہ ہو
ملتی ہے یہاں خوشبوئے وفا آہستہ گزر آہستہ گزر

دو پھول چڑھایا اشک بہا کچھ فرق نہیں پڑتا ساقی
چلتی ہے یہیں سے رسمِ وفا آہستہ گزر آہستہ گزر

اے ابرِ سیہ، کچھ اور سنبھل چلنا ہے تو دھیرے دھیرے چل
ڈسا منہ ہے زلفوں کی گھٹا آہستہ گزر آہستہ گزر

اے محرمِ خلوت! موجِ صبا! جذباتِ محبت عام نہ کر
ہو جائے نہ گُل پھر شمعِ وفا آہستہ گزر آہستہ گزر

مانوس بھی ہوں، مانوس نہیں آواز یہ کس کی ہے نیّر!
کانوں میں کبھی آتی ہے صدا آہستہ گزر آہستہ گزر

شبِ غم آنکھ بھر آئے تو مجھ کو یاد کر لینا
کبھی دامن سلگ جائے تو مجھ کو یاد کر لینا

بہ جبرِ دل بہ اندازِ وفا جب شمع کی لو پر
کوئی پروانہ جل جائے تو مجھ کو یاد کر لینا

سکوں کی جستجو میں اتفاقاً اجنبی کوئی
تری محفل میں آ جائے تو مجھ کو یاد کر لینا

مرے آنسو ہی ممکن ہے ترے کچھ کام آ جائیں
اگر دامن پہ آنچ آ جائے تو مجھ کو یاد کر لینا

کبھی تنہائیوں میں اور کبھی سونی شبستاں میں
تمہارا دل جو گھبرائے تو مجھ کو یاد کر لینا

کوئی دیوانہ غم سے تنگ آ کر بزمِ رنداں میں
کبھی پی کر بہک جائے تو مجھ کو یاد کر لینا

تمہارے نام سے منسوب کر کے کوئی دیوانہ
غزل نیّر کی سنوائے تو مجھ کو یاد کر لینا

میرے حالات ہی ایسے ہیں تو رنجیدہ نہ ہو
دل گرفتہ نہ ہو، آزردہ و نم دیدہ نہ ہو

کیا ملا تجھ کو بھی اشکوں کے سوا جانِ وفا
میں نہ کہتا تھا کہ اتنا مرا گرویدہ نہ ہو

خوفِ رسوائی سے آواز بدلتا ہوں مگر
یہ لب و لہجہ کہیں تیرا پسندیدہ نہ ہو

اے غمِ دوست! ترا مجھ پہ ہے احسان بہت
اک تبسم کے لیے اتنا تو رنجیدہ نہ ہو

دل کے تاروں کو ذرا چھیڑ کے اندازہ کر
نغمۂ درد کہیں ساز میں خوابیدہ نہ ہو

تم مرے جذبۂ بے لوث کو سمجھو تو سہی
مجھ پہ الزامِ تمنا بھی تراشیدہ نہ ہو

ایسی اک بزم میں لے چلئے مجھے اب نیرؔ!
میری ہی طرح جہاں کوئی بھی نم دیدہ نہ ہو

جہاں کہیں بھی رہے، دل سے تُو نہیں جاتی
مرے بدن سے کبھی تیری بُو نہیں جاتی

ہزاروں سسکیاں دیوار و در میں ہیں محفوظ
یہاں سے دور کہیں گفتگو نہیں جاتی

سمٹ سمٹ کے لپٹتی ہے اپنے بستر سے
تمہاری خوشبو کبھی چار سو نہیں جاتی

تمہیں بتاؤ کہ بے لوث جذبۂ دل کو
تمہارے پانے کی کیوں آرزو نہیں جاتی

گریز پا ہیں جو رسوائیاں تو رہنے دو
سُپردگی سے کبھی آبرو نہیں جاتی

حصارِ شہر سے ٹکرانے آ گئی نیّرؔ!
دیارِ دوست تلک جستجو نہیں جاتی

دامن میں کچھ نہ تھا کوئی تحفہ نہ دے سکا
تم جا رہے تھے تم کو دلاسا نہ دے سکا

وہ شخص لے گیا مری آنکھوں کی روشنی
میں جس کو اپنے گھر کا اُجالا نہ دے سکا

تم خود ہی بے نیاز رہے شاید اس لیے
کوئی بھی بڑھ کے تم کو سہارا نہ دے سکا

دل کے سوا یہاں مرا سب کچھ لُٹا مگر
پھر بھی کسی بھی دوست کو دھوکہ نہ دے سکا

آنگن میں اپنے قدموں کی آہٹ کو چھوڑ کر
تم جا رہے تھے اس لیے رستہ نہ دے سکا

نیّر بہت سے مرحلے آئے حیات میں
تا عمر میرا دل مجھے دھوکا نہ دے سکا

شاہین زادہ کیسے گرفتار ہو گیا
جو سائبان تھا پسِ دیوار ہو گیا

آنے لگی تھیں پھر ترے قدموں کی آہٹیں
سناٹا گھر کا جب لبِ اظہار ہو گیا

خوشبو نواز لمس کا وہ لمحۂ نشاط
ہونٹوں کو تیرے چھوتے ہی سرشار ہو گیا

کشتی ڈبو کے جو کسی ساحل سے جا ملا
وہ دستِ ناشناس ہی پتوار ہو گیا

وہ لمحۂ خرد جو جنوں آشنا نہ تھا
قدموں کو تیرے چھو کے بھی بیکار ہو گیا

نیّر بدل دو جینے کا انداز پھر یہاں
جب سانس لینا شہر میں آزار ہو گیا

تیری مبہم سی بدگمانی سے
ربط ٹوٹا ہے شادمانی سے

حالِ دل دیکھ کر سمجھ لیجے
ہونٹ قاصر ہیں ترجمانی سے

کیسے کیسوں کا ظرف کھلتا ہے
مفلسی تیری مہربانی سے

چشمِ احساس کی نمی بہتر
زندگی بھر کی نوحہ خوانی سے

پست ہوتی ہے اور قدرِ ہنر
کم سوادوں کی قدردانی سے

زندگی کا مزاج ہی بدلا
نامکمل سی اک کہانی سے

فاصلے اور بڑھ گئے نیّر!
خضرِ رہبر کی مہربانی سے

تم ہی بتاؤ یہ کوئی اچھا شگون ہے
سہمی ہوئی حیات کی آنکھوں میں خون ہے

اٹھتی ہیں اب بھی زخمِ تمنّا پہ انگلیاں
کیوں اِس قدر نگاہِ ہوس بدشگون ہے

زلفوں کی چھاؤں سایۂ دیوار تو نہیں
ہاں پھر بھی نسبتاً یہ فضا پُرسکون ہے

کیا جانے رنگ لائے گا کب اضطرابِ دل
کچھ دن سے مجھ کو اور بھی ذہنی سکون ہے

پھولوں کے پیرہن میں ہیں کانٹے سلے ہوئے
اب کے برس کی رُت بھی عجب بدشگون ہے

نیّر ہے اب بھی اُس گُلِ تازہ کی آرزو
جس کے ورق ورق پہ مرے دل کا خون ہے

اتنا مانوس ہے کیوں مجھ سے خیالِ محسن
ایک اک لمحہ مرے دل پہ گراں ہے تجھ بن

تم سے وابستہ ہر اک لمحہ مہک اٹھتا ہے
یاد آجاتے ہیں جب بھی مجھے بیتے ہوئے دن

میری آوارہ مزاجی کی شکایت نہ کرو
ایک دن تم پہ کھلے گا مرا حُسنِ باطن

جو گیا وقت ہے واپس نہیں آئے گا کبھی
اِتنی بے تابی سے گزرے ہوئے لمحوں کو نہ گِن

آج تک بھی وہ قریبِ رگِ جاں ہے میرے
جس کو دیکھا تھا بہت دور سے میں نے اک دن

موت خود کرنے لگی میری حفاظت نیرّ!
کس نے باندھا مرے بازو پہ امامِ ضامن

پھرتے تھے کل جو شہر میں قاتل بنے ہوئے
بیٹھے ہیں آج صاحبِ محفل بنے ہوئے

ہم نے یہاں جنھیں نظر انداز کر دیا
وہ حادثے ہیں عمر کا حاصل بنے ہوئے

لہروں کو گن رہے ہیں بڑے اشتیاق سے
کچھ ناشناس، زحمتِ ساحل بنے ہوئے

ہم عمر بھر سمجھتے رہے جن کو خوشگوار
لمحے وہی ہیں عارضۂ دل بنے ہوئے

دردآشنا ہمیں، یہاں کوئی نہیں ملا
جب ہم تھے غم اٹھانے کے قابل بنے ہوئے

کیا وقت ہے کہ اُن کو سہارے کی ہے تلاش
جو دل کبھی تھے رہبرِ منزل بنے ہوئے

نیر! یہ اور بات ہے صحرانشیں ہیں اب
لیکن کبھی تھے رونقِ محفل بنے ہوئے

مہمان بن کے آئے مگر گھر میں رہ گئے
کچھ پھول تیری زلفوں کے بستر میں رہ گئے

کون اب کرے گا صحرا نوردوں سے گفتگو
جھونکے بہارِ نو کے گُلِ تر میں رہ گئے

ملنے لگا ہے اب مری پہچان کا ثبوت
آنسو نہ جانے کیسے یہ ساغر میں رہ گئے

جانا تھا جن کو جا چکے میدان چھوڑ کر
ہم جیسے سرفروش ہی لشکر میں رہ گئے

محنت کے ہاتھ چومتا رہتا ہوں اس لیے
کچھ پھول تیرے ہاتھوں کے پتھر میں رہ گئے

نیّر ! ہے جن سے نسبت دیرینہ آج بھی
کچھ ایسے خار پھولوں کی چادر میں رہ گئے

خود ہی دب جائے گی ہمسایہ کی اونچی آواز
آپ بدلیں تو سہی اپنا گھریلو انداز

گھر سے جب ماں کے قدم چھو کے نکل جاتا ہوں
زندگی اور بڑھا دیتی ہے میرا اعزاز

سجدۂ شوق کو پائیں گے کہاں دیر و حرم
روبرو آپ ہیں جب ہو چکی بس اپنی نماز

راستے شہر تمنا کے سمٹ جاتے ہیں
ایک منزل پہ ٹھہر جاتے ہیں جب ناز و نیاز

جاگتی آنکھوں میں ہے اپنی اُجالا نہ دُھواں
اپنی خاموشی وفا کا ہے یہ کیسا اعجاز

دل نے زخموں کو چھپانا تو بہت چاہا مگر
چشمِ پُرنم تو ہمیشہ ہی رہی ہے غماز

کس کی آواز سے سمجھوتہ کرو گے نیرؔ!
اِس طرف ٹوٹا ہوا دل ہے اُدھر پردۂ ساز

اب کہاں جائے گا مجھ جیسا مسافر گھر گھر
منتظر کب سے ہوں دروازہ پہ دستک دے کر

جانے کب کون دبے پاؤں یہاں آیا تھا
گرم ہے آج تلک بھی وہ مہکتا بستر

اب تو بے سائیاں لوگوں میں بسر ہوتی ہے
تم نے آواز نہ دی میرے ہی گھر میں رہ کر

ہم تو برسوں سے ہیں مخمور نگاہی کے اسیر
اپنی آنکھوں کو جھکاؤ کہ بڑھاؤ ساغر

مجھ کو احساس کہاں ہوگا اکیلے پن کا
تم تو رہتے ہو ہمیشہ کی طرح ساتھ اکثر

جس کو چھونے سے تھکن دور ہوا کرتی تھی
میرا وہ لمحۂ شاداب کہاں ہے نیّر!

اِس بھری بزم میں پھر ماتمِ تنہائی ہے
میں نے چُپ رہنے کی یہ کیسی سزا پائی ہے

جب تلک ہم نہ لُٹے ہم کو نہ تھا اندازہ
قاتلِ شہر کی کس کس سے شناسائی ہے

اب کہاں لوگ ہیں بے داغ گُلِ تر کی طرح
سب کے سب زخمی ہیں یہ کیسی مسیحائی ہے

فصلِ گُل اوروں کے گھر آئی تو آئی ہوگی
اپنے آنگن میں تو رُک رُک کے بہار آئی ہے

کب تلک نکلے گا اِس شہر میں لاشوں کا جلوس
جو بھی ہے شہر میں خاموش تماشائی ہے

جو بھی کہنا ہے سرِ بزم کہوں گا نیّرؔ!
چُپ رہوں گا بھی تو اندیشۂ رسوائی ہے

جو عطر بیز تھے وہ دن کہاں گئے جاناں
ہر ایک شخص تھا محفل میں شاد ملی جاناں

یہ کیسا تحفہ ہے پیراہنِ نظر کے لیے
شگفتہ پھول ہیں کانٹوں کے درمیاں جاناں

جہاں جہاں سے بھی گزرا ہیں سر جھکائے ہوئے
تمہارے نقشِ قدم تھے وہاں وہاں جاناں

تم اپنی یادوں کی خوشبو بھی ساتھ لے آنا
اُداس اُداس سی ہے بزمِ دوستاں جاناں

مرے سلوک کی ضامن ہے میری تشنہ لبی
ستم تو یہ ہے کہ تم بھی ہو بدگماں جاناں

تڑپ تڑپ کے تمہیں جب بھی ہم نے یاد کیا
ہمارے گھر میں اُتر آئی کہکشاں جاناں

اگرچہ اُس کو سلیقہ ہے گفتگو کا مگر
تمہارے سامنے نیّر! ہے بے زباں جاناں

اپنی شکست آپ ہیں ہم، تم سے کیا گلہ
حالانکہ تم سے ملتا ہے خوشبو کا سلسلہ

اک اور گُل تھا زینتِ گلشن بنا ہوا
لیکن وہ پھول فصلِ بہاراں میں جل گیا

حدِ نظر تلک نہ اندھیرا نہ روشنی
میں سوچتا ہوں نورِ بصیرت کو کیا ہوا

رسوائے شہر ہونا مقدّر کی بات ہے،
یہ کیا کیا کہ تم نے بھی دامن بچا لیا

مجھ کو تو صرف حُسنِ نظر کی تلاش ہے
تاریک راستوں میں اجالا ہوا تو کیا

رگ رگ میں بس گئی تری خوشبوئے پیرہن
شاید مری حیات ہے پھولوں کا سلسلہ

نیّرؔ کو جب ملا نہ کہیں نقشِ پا ترا
تجھ سے نظر بچا کے بہت دور تک گیا

حدودِ غم سے نکل کر مجھے تو کچھ نہ ملا
چلن خوشی کا بدل کر مجھے تو کچھ نہ ملا

یہ اور بات ہے اوروں کے گھر ہوئے روشن
تمہاری بزم میں جل کر مجھے تو کچھ نہ ملا

کسی کی بھیگتی پلکوں پہ تیرا دامن تھا
مثالِ شمع پگھل کر مجھے تو کچھ نہ ملا

مرے بھٹکنے سے اوروں نے منزلیں پائیں
قدم قدم پہ سنبھل کر مجھے تو کچھ نہ ملا

مرے نصیب میں خوشبوئے زلفِ دوست کہاں
وفا کی چھاؤں میں پل کر مجھے تو کچھ نہ ملا

تمہاری راہ میں نقشِ قدم تھے اوروں کے
تمہاری راہ پہ چل کر مجھے تو کچھ نہ ملا

ہے غم یہی مری پہچان کھو گئی نیرؔ!
کسی کے رنگ میں ڈھل کر مجھے تو کچھ نہ ملا

کون جلتا ہے سرِ شام تمہیں کیا معلوم
کون ہے شہر میں بد نام تمہیں کیا معلوم

شمع کی لو پہ نظر رہتی ہے سب کی لیکن
ایک پروانے کا انجام تمہیں کیا معلوم

بھیگتی مہکی ہوئی رات کی آغوش میں بھی
کتنے دل جلتے ہیں گمنام تمہیں کیا معلوم

دردِ بے نام کو خاطر میں نہ لانے والو!
کس قدر ہے مجھے آرام تمہیں کیا معلوم

طنز آمیز تبسم کی ضرورت کیا تھی
کیوں ہیں ہم موردِ الزام تمہیں کیا معلوم

میری خاموش پرستش کا کوئی نام تو ہو
عمر بھر کا ہے یہ انعام تمہیں کیا معلوم

تم کو آزادیٔ پرواز مبارک نیّر!
جو گزرتی ہے تہِ دام تمہیں کیا معلوم

اوڑھے ہوئے کفن ہے ہر اک لمحۂ جدید
یادوں کا زہر پی کے یوں آئی ہے اب کے عید

پیراہنِ نظر کو تمازت نے چھو لیا
پگھلا ہے برف بن کے ہر اک وعدۂ وعید

اے ناشناسِ قدر! ترے انتظار میں
اِس طرح دل جلا ہے کہ آنکھیں ہوئیں سپید

ہونٹوں کا زہر پہلے ہی تقسیم ہو گیا
پیاسی نظر بڑھانے لگی تشنگی مزید

تحلیل جسم ہو گیا، پرچھائیں رہ گئی
لیکن کبھی نہ ختم ہوئی آرزوئے دید

ہر اک شگفتہ چہرہ نقابوں میں چھپ گیا
سہوِ نظر کا ردِّ عمل اِس قدر شدید

کس شہرِ دل نواز میں نیّرؔ ہیں ان دنوں
مل کر ہوئی ہے اُن سے بھی اک مدّت مدید

جب تم نہ تھے لہو کا خریدار کون تھا
معلوم سب کو ہے پسِ دیوار کون تھا

جب ہم نہیں تھے صاحبِ کردار کون تھا
لٹنے کے بعد بھی سرِ بازار کون تھا

کچھ لوگ اپنے ہاتھوں میں خنجر لیے ہوئے
ہم سے بھی پوچھتے ہیں خطا کار کون تھا

پوچھے گا کون جا کے فقیہانِ شہر سے
کس کو سزا ملی ہے گنہگار کون تھا

ہم سے نہیں یہ سازشی لوگوں سے پوچھیے
مظلوم ہم نہیں تو سرِ دار کون تھا

نیّر بتائے گی در و دیوار کی شکن!
خاموشیوں میں بھی لبِ اظہار کون تھا

جو چشمِ نم کے جزیرے سے ہو کے آئے ہیں
وہ لوگ ہی مری کشتی ڈبو کے آئے ہیں

چمن کے سینے پہ وہ کیا گلاب گائیں گے
جو زہرِ فرقہ پرستی کا بو کے آئے ہیں

تمہاری بزم میں آسودگی کے دھوکے میں
تمام عمر کا سرمایہ کھو کے آئے ہیں

وہی بتائیں گے اسرارِ زندگی کیا ہے
جو لوگ موت کی باہوں میں سو کے آئے ہیں

یہ سرخ سرخ سی آنکھیں یہ نم لب و عارض
کچھ ایسا لگتا ہے وہ آج رو کے آئے ہیں

زمانہ بدلا تو نیّر! یہ امن کے وارث
کسی کی لاش میں خنجر چبھو کے آئے ہیں

بے لوث پیار کی ہمیں اچھی سزا ملی
یہ زندگی ملی بھی تو بے دست و پا ملی

پیاسی نگاہ آج تلک بھی ہے در بہ در
اک لمحۂ سکوں کے لیے تم سے کیا ملی

جب بھی ہوا ہے پیرہنِ گُل کا تذکرہ
زخمِ حیات، سلسلہ در سلسلہ ملی

ان اونچے اونچے محلوں میں گھُٹنے لگا تھا دم
آنگن کو پیار کرتے ہی تازہ ہوا ملی

زخمی دل و نظر کی طرح خانقاہ میں
اک آہِ دل نشیں بھی شریکِ دُعا ملی

نیّرؔ! کچھ ایسی گرم ہوا تھی چمن چمن
شرمندہ ہم سے اب کے بھی بادِ صبا ملی

فصلِ بہار آ گئی اب بھی نہ آئیے گا کیا
جاگ اُٹھی کلی کلی اب بھی نہ آئیے گا کیا

یادوں کی ایک انجمن، پھرتی ہوی چمن چمن
دل کے قریب رک گئی اب بھی نہ آئیے گا کیا

دُنیائے آرزو مری مدّت کے بعد ہی سہی
خوشبو میں ہے بسی ہوی اب بھی نہ آئیے گا کیا

دل میں ہے آج درد کم، پلکیں بھی شام سے ہیں نم
نبضِ حیات تھم گئی اب بھی نہ آئیے گا کیا

بجھ گئی شمعِ آرزو، آنکھوں سے ہے رواں لہو
دل کی بساط اُلٹ گئی اب بھی نہ آئیے گا کیا

کلیوں کے نرم لب ہلے گلشن میں پھول ہنس پڑے
شبنم کی آنکھ تر ہوی اب بھی نہ آئیے گا کیا

کیسی ہی انجمن سہی، نیّر کی انجمن ہے یہ
بجھنے لگی ہے زندگی اب بھی نہ آئیے گا کیا

کل شام سے آنکھوں میں وہی جانِ غزل ہے
پلکوں کے اُبھرو کوں میں کوئی تاج محل ہے

احساس کی شمعوں کی لویں اور بڑھا دو
خاموش پرستش کے لیے ایک ہی پل ہے

شمعیں بھی بجھیں، دل بھی مگر آس نہ ٹوٹی
آنا ترا اے دوست! بہرحال اٹل ہے

کچھ تم سے شکایت نہیں احساس ہے اتنا
جو اشک ہے پلکوں پہ تبسم کا بدل ہے

جب سے کہ ہوا خوانِ وفا، خونِ تمنا
اُس وقت سے پلکوں پہ مری رنگ محل ہے

اک حادثۂ شوق سرِ شام ہوا تھا
اُس وقت سے اب تک مری نیندوں میں خلل ہے

وہ شامِ غزل آج بھی آنکھوں میں ہے نیرؔ!
جس بزم کا حاصل یہ مری تازہ غزل ہے

یادِ ماضی ہے سرمایۂ دل مرا ذکرِ ماضی ہے تسکینِ جاں دوستو
بے وفا اجنبی کی امانت ہے یہ مجھ سے چھینو نہ تنہائیاں دوستو

دردِ بے نام کی شمعیں جلتی رہیں، رات بھر بھیگی پلکیں سلگتی رہیں
ہر نفس میں بھڑکتی تھی قندیلِ غم، جب بھی بڑھتا تھا دردِ نہاں دوستو

خانۂ دل میں امید کا اک دیا، اپنی حالت پہ آنسو بہاتا رہا
زندگی جب ہوئی وقفِ شامِ الم، چشمِ نم بن گئی خوں فشاں دوستو

دل کی محرومیوں کا ہی غم کم نہ تھا، سی لیے ہونٹ ہم نے مگر کیا ملا
اب بھی جس راستے سے گزرتے ہیں ہم، ساتھ چلتی ہیں رسوائیاں دوستو

رات بھاری ہے بیمارِ غم پر مگر، ہے دیارِ وفا میں اُجالا ابھی
جل رہی ہے برابر کوئی شمعِ دل، اٹھ رہا ہے مسلسل دھواں دوستو

راستہ شہرِ دل کا ہے ویران سا، جادۂ زندگانی ہے سنسان سا
کس کے راہِ وفا میں قدم رک گئے، رک گیا وقت کا کارواں دوستو

شدّتِ غم سے اے نیرِ غم زدہ! عظمتِ غم میں ہوتی نہیں کچھ کمی
لاکھ پامالِ جورِ خزاں ہو مگر گلستاں پھر بھی ہے گلستاں دوستو

سرحد سرحد خون ہے ارزاں
شہر میں لیکن جشنِ چراغاں

قبضہ میں رکھ کر صبحِ درخشاں
بھٹکا ہوا ہے آج کا انساں

پھولوں کے ہیں چاک گریباں
کم نہ ہو یارو! حُسنِ گلستاں

صحرا صحرا گُل بکھرے ہیں
پھول کی قیمت اِتنی ارزاں

صبحِ وطن کو ڈھونڈنے والو
بھول نہ جانا شامِ غریباں

شب کا دامن بھیگ چکا ہے
پاس کھڑی ہے صبحِ درخشاں

رات کی شمعیں بجھنے لگی ہیں
جاگ بھی جاؤ نیرِ تاباں

مجھ کو توفیقِ انتظارِ شدید
تیرا وعدہ ہے لائقِ تجدید

پرسشِ حال اور یہ طنزِ لطیف
میرے زخموں پہ ہے کھلی تنقید

آتے رہیے یوں ہی تصوّر میں
رہنے دیجیے رہی سہی امید

شمعیں بجھتی ہیں، دل سلگتے ہیں
ہائے کیا چیز ہوتی ہے امید

آپ محفل سے چل دیئے لیکن
بن گئے ہم نشانۂ تنقید

رخصت اے تیرگیٔ آخرِ شب
جگمگاتا ہے چہرۂ خورشید

دردِ دل اور بڑھ گیا نیّر
بھیگی پلکوں نے کی ہے جب تائید

آپ تو پیتے نہیں، ہم سے کہا جاتا ہے
کس سلیقے سے ہمیں زہر دیا جاتا ہے

تیرا دیوانہ بڑھاتا ہے کہاں دستِ سوال
ہاتھ خالی ہوں تو محفل سے چلا جاتا ہے

جب بھی آ جاتا ہے ساقی کی نگاہوں کا سوال
ایک ایک گھونٹ بھی مشکل سے پیا جاتا ہے

آخرِ شب کسی مے خانہ پہ دستک دے کر
تیرا دیوانہ بہت دور چلا جاتا ہے

چاہنے والے کو بے وجہ تو الزام نہ دو
ہو گی رسوائی مری آپ کا کیا جاتا ہے

رونقِ بزم کبھی کم نہیں ہوتی نیّر!
کوئی آتا ہے یہاں کوئی چلا جاتا ہے

رندوں کو جو مے خانے میں پینے نہیں دیں گے
ہم اُن کو کبھی چین سے جینے نہیں دیں گے

ساحل پہ ڈبو دیں گے سبھی کشتیاں لیکن
ثابت تمہیں ہم اپنے سفینے نہیں دیں گے

قائم ہے یہاں خانہ بدوشوں کی بھی اک شان
ہم اپنے قبیلے کے قرینے نہیں دیں گے

دامن پہ اُتر آئیں تو چُن لیجئے آنسو
جو دفن ہیں سینے میں دفینے نہیں دیں گے

ہمت ہے تو آ جایئے دروازہ کھُلا ہے
ہم گھر میں اترنے کبھی زینے نہیں دیں گے

جو دے کے گیا زخم اُسے ڈھونڈیئے نیّر!
ہم زخم کسی اور کو سینے نہیں دیں گے

جو جا چکا ہے وہ بارِ دِگر نہیں آیا
تمہارے بعد کوئی میرے گھر نہیں آیا

وہ ایک جھونکا جو خوشبو کی طرح آیا تھا
بہت ہی ڈھونڈا کہیں پھر نظر نہیں آیا

اثر مجھی پہ ہوا تیری کج کُلاہی کا
بجز مرے کوئی زیرِ اثر نہیں آیا

نہ جانے رہتا ہے وہ شخص کتنی دُوری پر
تمام عمر چلا اُس کا گھر نہیں آیا

بہت سے لوگ اندھیروں سے بچ کے آئے مگر
کسی کے چہرے پہ رنگِ سحر نہیں آیا

ہمارے شہر میں نیّر! نہ جانے بات ہے کیا
بہت دنوں سے وہ آئینہ گر نہیں آیا

ضبط کے قابل سمجھتا تھا اگر قاتل مجھے
شہر کی گلیوں سے کیوں لایا سرِ محفل مجھے

میں نے ایک اک کو دیا ناکامیوں کا واسطہ
زندگی! خود تو نے کب سمجھا کسی قابل مجھے

سوزِ دل، شائستگیِ ربط کا انعام ہے
درد کی قیمت کے اندازے سے کیا حاصل مجھے

اخترؔ ماحول کے زخموں کی زباں کھلنے لگی
موسمِ گل نے کیا نغموں پہ جب مائل مجھے

ایسی نظروں سے نہ دیکھو اور کچھ دن کے لیے
ایسی ہی نظروں سے تم نے کر دیا گھائل مجھے

زندگی انجمن سہی، وابستۂ آداب ہے
کاش! شائستہ سمجھتی آپ کی محفل مجھے

زندگی کے غم تو نیّر! زندگی کے ساتھ ہیں
دُور ہوں تم سے مگر سمجھو قریبِ دل مجھے

جب سے نگاہِ دوست میں معزول ہوگیا
شہرِ غزل میں اور بھی مقبول ہوگیا

یہ سب تمہارے دستِ حنائی کا فیض ہے
جس خار کو بھی تم نے چھُوا پھول ہو گیا

دل کے معاملے میں کوئی قیدِ وقت کیا
یادِ حبیب روز کا معمول ہوگیا

اس دورِ بے یقینی کا اک یہ بھی روپ ہے
قاتل نگاہِ وقت میں مقتول ہوگیا

بدنامِ شہر اب جو تقدس مآب ہے
رندوں میں اُٹھتے بیٹھتے معقول ہوگیا

ناسور اپنے چھوڑ کے دیوانۂ حیات
اوروں کے زخم سینے میں مشغول ہوگیا

نیّر! شگفتہ یادوں کی جب لہر آگئی
ہر زخم مسکراتا ہوا پھول ہوگیا

نظروں میں تمہاری وہی اک بات کھلی ہے
جو بات کہ ہر شخص کے ہمراہ چلی ہے

جو اپنے ہی احساس کی گرمی سے ہے روشن
محفل میں تری ایسی بھی اک شمع جلی ہے

میں نے روشِ گُل کا بہت نام سنا تھا
حالانکہ مِری زندگی کانٹوں پہ چلی ہے

ڈرتا ہوں نہ ہو جائے کہیں خونِ تمنّا
احساس کی دیوی بڑے نازوں سے پلی ہے

منزل ہے بہت دُور ابھی آخرِ شب کی
اِس سوچ میں ہوں میں کہ ابھی شام ڈھلی ہے

ہر موجِ صبا، محسنِ گلزار ہے لیکن
کانٹوں کی نگاہوں میں بھی ہر ایک کلی ہے

خوشیوں کو سمجھنے کا سلیقہ تو ہے نیّر!
ہر سانس مگر درد کے سانچوں میں ڈھلی ہے

کب ہم پہ حادثات کی پرچھائیاں نہ تھیں
تم ساتھ تھے تو اتنی پریشانیاں نہ تھیں

خاموش تم بھی رہتے سو خاموش میں بھی ہوں
جینے کی یہ ادائیں کبھی درمیاں نہ تھیں

سائے کی طرح پھیل رہا تھا مرا وجود
جب تجھ پہ تیرے پیار کی پرچھائیاں نہ تھیں

جس وقت ہم بھی آئے تھے زنداں سے چھوٹ کر
چوکھٹ پہ انتظار کی تنہائیاں نہ تھیں

خوشبو کے ساتھ آیا تھا یادوں کا قافلہ
سمٹی ہوئی کبھی مری تنہائیاں نہ تھیں

اب تو معاشرے سے ہے ٹکراؤ رات دن
جب تک کہ ساتھ تم رہے کچھ تلخیاں نہ تھیں

چشمِ کرم نے خود نظر انداز کر دیا
نیرؔ کی طرح مجھ میں بھی کب خامیاں نہ تھیں

پھر اندھیرے گھر میں میرے روشنی ہو جائے گی
آپ جب لوٹیں تو دنیا دوسری ہو جائے گی

آپ کی بے اعتنائی گر یوں ہی جاری رہی
اک نہ اک دن آپ سے بھی دوستی ہو جائے گی

پھر مری پہچان کا محفل میں اُٹھے گا سوال
تیری شخصیت کی جس دن بھی نفی ہو جائے گی

دوستو! رہنے بھی دو اس فاقہ مستی کا بھرم
ہاتھ پھیلانے سے توہینِ خودی ہو جائے گی

دن بلائے آپ کی چوکھٹ پہ آ بیٹھوں گا میں
جب کبھی رسوا مری تشنہ لبی ہو جائے گی

بال بکھرائے اُسی انداز سے پھر آیئے
آپ کی قربت سے اچھی شاعری ہو جائے گی

اس لیے تیرؔ کو پھر کھونا نہیں چاہوں گا میں
ایک اچھے دوست کی پھر سے کمی ہو جائے گی

کب تلک ہم بھی رہیں بے سر و سامانِ حیات
کونسی رُت میں رفو ہوگا گریبانِ حیات

اب تو ٹوٹا ہوا آئینہ بھی ہاتھوں میں نہیں
کون سلجھائے گا اب زلفِ پریشانِ حیات

زندگانی! تری پہچان بڑی مشکل ہے
ہم فقیروں کی دُعاؤں سے بڑھی شانِ حیات

جس کی خاطر یہاں شبنم نے بہائے آنسو
تشنہ لب اب بھی ہے وہ شامِ غریبانِ حیات

مجھ کو تنہا تو نہ کر دیدۂ پُرنم کی طرح
عمر بھر ساتھ رہا ہے ترا اے جانِ حیات

خونِ ارماں ہے اِدھر اور اُدھر دل کا لہو
کون سے رنگ سے لکھتا رہوں عنوانِ حیات

کاش ملتی ہمیں چھونے کی سعادت نیّرؔ!
ماں کے قدموں کی طرح رہتا ہے دامانِ حیات

کس کس کو یہاں کرتے رہو گے نظر انداز
چھو لے گی بلندی کو کبھی گرمیٔ پرواز

لہجے کی متانت کو بچا رکھیے خدا را
آواز بدل جائے تو چھن جائے گا اعزاز

پھر کس لیے سمجھوتہ کیا تم نے صبا سے
تنہائی میں بھی جینے کا تم کو تھا بڑا ناز

سونپا تھا امانت کی طرح تم نے جو مجھ کو
برسوں سے مرے سینے میں ہے دفن وہ اک راز

مدت ہوئی سب تارِ نفس ٹوٹ چکے ہیں
اِس شہرِ خموشاں میں کوئی ساز نہ آواز

نیّر! یہ ہے سب ایک ہی رشتے کا تسلسل
خوشبو کا سفر ہو، گُلِ تازہ ہو کہ شہباز

پھیلے گا زہر بن کر قوموں کی زندگی میں
وہ خوف جو ہے شامل احساسِ کمتری میں

یہ فائدہ ہوا ہے دشمن سے دوستی میں
قد اُس کا گھٹ گیا ہے تجھ سے برابری میں

ہے بوریا نشینی مسند نواز اب بھی
وہ بانکپن ملا ہے طرزِ قلندری میں

پیاسے لبوں سے آیا خوشبو کا ایسا جھونکا
ہم کربلا تک آئے احساسِ تشنگی میں

شامِ غریباں اب بھی دُہرا رہی ہے اُس کو
جو نام رہ گیا تھا عنوانِ زندگی میں

سوغاتِ دیدۂ نم ہم خود ہی چھوڑ آئے
لوٹے ہیں تیرے در سے اشکوں کی روشنی میں

برسوں کی آرزو ہے مجھ کو بھی اب عطا کر
جو تازگی ہے یارب نیّر کی دوستی میں

میں ڈر رہا ہوں اسی آہِ صبح گاہی سے
الجھ گئی تھی کسی دن جو تاجِ شاہی سے

وہی جنوں، وہی خودداریاں سلامت ہیں
میں جی رہا ہوں اسی شانِ کج کلاہی سے

قدم قدم پہ جو ہر اک کا پوچھتا ہے پتہ
ملا ہوں میں بھی سرِ راہ ایسے راہی سے

میں جانتا ہوں کہ آنکھوں میں تیری سب کچھ ہے
مگر گلہ ہے مجھے اپنی کم نگاہی سے

علاجِ درد جو تم سے نہ ہو سکا ممکن
تمہیں بھی کیوں ہے ندامت مری تباہی سے

جو اپنی راہوں سے بھٹکا ہوا ہے خود تیرا
پتہ وہ پوچھتے پھرتے ہیں ایسے راہی سے

یہ کس کا خون ہے مقتل میں قاتل بھی پشیماں ہے
لہو انسان کا اس دور میں بھی کتنا ارزاں ہے

یہی بہتر ہے اپنا اپنا ہم خود جائزہ لے لیں
کسی کو بے وفا اے دوست کہہ دینا تو آساں ہے

زباں بندی کا کیا شکوہ مگر حالات ایسے ہیں
لہو سے میرے اُن کی بزم میں جشنِ چراغاں ہے

عیادت کا بھرم کھلنے نہ پائے اب تو آجاؤ
مریضِ عشق شاید اور کچھ لمحوں کا مہماں ہے

جہاں پر دوستو سب رشتے ناطے ٹوٹ جاتے ہیں
مری آنکھوں میں اب تک بھی وہی شامِ غریباں ہے

فضا گلشن کی کہتی ہے چمن والوں سے کیا پوچھیں
خزاں کے نام سے موسوم اب فصلِ بہاراں ہے

مجھے تنہا نہ سمجھیں آپ کچھ اپنے لیے سوچیں
مرے ہمراہ نیّر! آج بھی وقتِ گریزاں ہے

تم آج پاس ہو کل مجھ کو بھولنا ہوگا
کسی نے جاتے ہوئے ایسا کیوں کہا ہوگا

لپٹ کے روتی ہے تصویرِ زندگی مجھ سے
یہ کس کے ہاتھوں سے آئینہ گر گیا ہوگا

لباسِ غنچہ و گُل سے ٹپک رہا ہے لہو
نسیمِ صبح نے کلیوں سے کیا کہا ہوگا

دنیا کی راہوں میں تم جس کو چھوڑ آئے تھے
وہ شخص آج تلک بھی وہیں کھڑا ہوگا

گزشتہ لمحوں کے اوراق کیوں الٹتے ہو
کسی کا ماضی اسی رات جل گیا ہوگا

نئے سفر کے لیے تم چلے گئے ہو مگر
یہ سوچ لو مری دنیا میں کیا رہا ہوگا

بھری بہار میں نیّر! گُلوں کے چہروں پہ
نہ جانے کس نے مرا نام لکھ دیا ہوگا

تم دوست تھے تو میرا یہاں کتنا مان تھا
کل جتنے گھر لٹے مرا پہلا مکان تھا

بے رسم دوستوں کی طرح پھیر لی نظر
مجھ پر وہ کل تلک تو بہت مہربان تھا

بھیگی ہوی نگاہوں سے کیا گفتگو کریں
دامن بتا رہا ہے کوئی درمیان تھا

کل جس کے سامنے سے ہٹائی گئی شراب
یارو! وہی تو محفلِ رنداں کی جان تھا

سنتے رہے حکایتِ جاناں تمام رات
کیسے کہیں کہ دیدۂ نم بے زبان تھا

اس طرح چشمِ دوست میں ہم اجنبی رہے
اپنے ہی گھر میں جیسے کوئی میہمان تھا

نیّرؔ! اگر ہے آپ پہ الزام قتل کا
نکلی جہاں سے لاش وہ کس کا مکان تھا

نظر آنے لگی ہے ایک ہی تصویر درپن سے
نہ جانے کب تمہیں میں نے سنا تھا دور درشن سے

یہ مجھ سے پوچھئے کیا فصلِ گُل نے گُل کھلائے ہیں
میں اپنے پاؤں میں کچھ خار لے آیا ہوں گلشن سے

بہت نزدیک سے چھونے کو خود ہی ہاتھ بڑھتے ہیں
نہ جانے کونسا رشتہ ہے میرا تیرے دامن سے

یہ سب کچھ آپ کے مہندی لگے قدموں کی برکت ہے
کہاں جائے گی یہ خوشبو ہمارے گھر کے آنگن سے

ابھی پوری طرح سے دل کو اپنے ٹوٹنے دیجے
نکل ہی آئیں گے کچھ آنسو کبھی پلکوں کی چلمن سے

تمہاری کم نگاہی نے بھی سب کچھ دے دیا مجھ کو
میں کتنا بے سہارا ہو گیا تھا ذہنی الجھن سے

تباہی میں مری اس کا بڑا حصہ رہا نیّر!
بہت مہنگا پڑا سمجھوتہ مجھ کو اپنے دشمن سے

اِن آنکھوں میں پھیلا ہوا کاجل نہ ملے گا
جو زخم تمہیں آج ملا، کل نہ ملے گا

خود اپنی ہی باہوں میں سمیٹے ہوئے رہیے
کل موسمِ گُل میں کوئی آنچل نہ ملے گا

آتی ہی رہیں گی یہاں کچھ ٹھنڈی ہوائیں
جو ٹوٹ کے برسے وہی بادل نہ ملے گا

جو کچھ بھی محبت میں ملے باندھ کے رکھنا
جو آج میسر ہے تمہیں کل نہ ملے گا

تسکینِ نظر کے لیے اک عمر پڑی ہے
تہذیبِ نظر کے لیے اِک پل نہ ملے گا

تلوار کبھی ہاتھ سے گرنے نہیں دینا
کل تیرے خیالات میں کس بل نہ ملے گا

الجھے گی حیات اور خردمندوں سے نیّر
جز رسمِ جنوں کوئی تمہیں حل نہ ملے گا

بھروسہ کم تھا مگر اعتبار کرتا رہا
تمام عمر ترا انتظار کرتا رہا

شکستگی میں بھی جینے کا حوصلہ پاکر
تمہاری پیاسی نگاہوں سے پیار کرتا رہا

دل و نظر کے تصادم میں رنگ بھرنے کو
تمہیں بھی اپنی طرح بے قرار کرتا رہا

میں دل دُکھا کے کہاں مطمئن رہا اے دوست
گناہ گاروں میں خود کو شمار کرتا رہا

نہ ٹوٹے تجھ سے کہیں سلسلہ محبت کا
خزاں کی رُت میں بھی جشنِ بہار کرتا رہا

سوالِ چشمِ کرم کا جہاں جہاں بھی اُٹھا
نگاہِ دوست پہ میں انحصار کرتا رہا

تمام زندگی تیری بس اک خوشی کے لیے
میں اپنے آپ کو تم پر نثار کرتا رہا

کتنی مشکل سے میں سمٹا ہوں بکھر جانے کے بعد
اس کا اندازہ ہوا ہے مجھ کو گھر جانے کے بعد

اپنے ہمسایہ کی ٹھنڈک پھر سے یاد آتی رہی
شہرِ نامعلوم میں کچھ دن ٹھہر جانے کے بعد

یوں ہوا محسوس زنجیروں میں ہوں جکڑا ہوا
آخرِ شب تیرے کوچے سے نکل جانے کے بعد

جانے وہ کس کے تعاقب میں گئی ہے دوستو
لوٹ کر آئی نہیں پہلی نظر جانے کے بعد

ایک نسبت مجھ کو بھی ٹوٹی ہوئی کشتی سے ہے
آؤں گا ساحل پہ میں دریا اُتر جانے کے بعد

تجھ سے ملنے کے لیے یہ وقت بھی موزوں نہیں
گفتگو ہوگی تری زلفیں سنور جانے کے بعد

رات بھر لڑتا رہا نیّر! اُجالوں کے لیے
صبح لے آئے ہو تم دستار، سر جانے کے بعد

نہ جانے کس کے لیے اپنا سر جھکاتا ہوں
دعا قبول ہو یا رب! کہ ہاتھ اٹھاتا ہوں

وداع کر کے تمہیں اک نئے سفر کے بعد
میں اپنے گھر بڑی مشکل سے لوٹ آیا ہوں

اِسی خیال سے کُملا نہ جائے تیرا بدن
میں تیرے سامنے ہر وقت مسکراتا ہوں

تمہیں منانے میں اک عمر کٹ گئی لیکن
کبھی کبھی میں بُری طرح ہار جاتا ہوں

تلاش کرتے ہیں کچھ لوگ اپنے آنگن میں
میں آئینے کی طرح جب بھی ٹوٹ جاتا ہوں

تمام رات تڑپنے کے خوف سے اکثر
چراغ دل میں سرِ شام ہی بجھاتا ہوں

معاملہ ہے مرے دل کا کیا کروں نیترا!
میں بن بلائے بھی اب اُس کے پاس جاتا ہوں

۱۵۱

میں شاعر ہوں مگر فکر و نظر کی حد وہاں تک ہے
رسائی دیدہ ور روشن ضمیروں کی جہاں تک ہے

وہاں تک ہم کو لے جائے گا رشتہ خود شناسی کا
زمیں کی پیاس جتنی دوستو! ابرِ رواں تک ہے

ہو اک ایسی صدا جو سینۂ شب چیر کر نکلے
یہ آوازِ جرس تو صرف اسی اک کارواں تک ہے

پڑا رہتا ہے چوکھٹ پر ہمیشہ بے نیازی سے
قلندر کی فضیلت بھی عطائے آستاں تک ہے

کہاں تم کھینچ کر لائے ہو، ہم خانہ بدوشوں کو
مسافر کے لیئے یہ چھاؤں سر پر سائباں تک ہے

کریں ہم کون سے دانش وروں سے گفتگو نیّرؔ!
ہمارے دور کی ذہنی تھکن خوابِ گراں تک ہے

شبِ غم جب بھی مجھ کو آپ اکثر یاد آتے ہیں
مری بھیگی ہوئی پلکوں سے تارے ٹوٹ جاتے ہیں

تمہاری یاد کے نشتر جو دل میں ڈوب جاتے ہیں
ہجومِ غم کے عالم میں بھی ہم تسکین پاتے ہیں

محبت میں ذرا سی بدگمانی بھی بہت کچھ ہے
اچانک زندگی بھر کے روابط ٹوٹ جاتے ہیں

خدایا خیر ہو یہ دو دلوں میں فاصلے کیسے
جہاں کچھ بے یقینی ہو سفینے ڈوب جاتے ہیں

تمہیں بھی روشنی مل جائے گی تم بھی چلے آنا
وفا کے راستوں میں ہم چراغِ دل جلاتے ہیں

تمہارا ہی لب و لہجہ ہمیں محسوس ہوتا ہے
صلاح الدین نیر جب غزل اپنی سناتے ہیں

بازارِ مصر ہو کہ زلیخا کی انجمن
ہر شخص کو عزیز تھا یوسف علیہ السلام کا بانکپن

بے نام کیسا درد دیا آپ نے مجھے
ہر وقت جیسے دل میں ہے کانٹے کی سی چبھن

پھولوں کی تازگی کو نہ اتنا سراہیے
کانٹے بھی ہیں محافظِ آرائشِ چمن

یہ بھی شمیم وقت کا احسان ہی تو ہے
مہکے ہوئے ہیں آج بھی پھولوں کے پیرہن

گلشن کے گوشے گوشے کی زینت بنے رہے
بے کچھ روز تک گلوں کے مہکتے ہوئے بدن

بستی وفا کی بھاگ متی کا یہ شہر ہے
ٹپکے ہے ہر روش سے قطب شہ کا بانکپن

تیرا وفا شناس زلیخا تھی خوش نصیب
روشن اندھیرے گھر میں تھا یوسف کا پیرہن

جب تک مجھے جینا ہے سلیقے سے جیوں گا
اے رسمِ وفا! تجھ کو نہ بدنام کروں گا

میں اپنی طرح آپ کو جلنے نہیں دوں گا
جلنا ہی جو ٹھہرا تو اکیلا ہی جلوں گا

گھبراؤ نہیں پیار کو رسوا نہ کروں گا
تم پاس سے گزرو بھی تو آواز نہ دوں گا

پلکوں میں چھپا لوں گا اُمڈتے ہوئے آنسو
لیکن ترے دامن کو میں آواز نہ دوں گا

رِستے ہوئے زخموں کو کلیجے سے لگا کر
کب تک میں ترے شہر میں آوارہ پھروں گا

جب خلوتِ غم میں ہو اندھیرا کبھی نیّرؔ!
میں آپ کی یادوں سے بھی کچھ روشنی لوں گا

رہنے دو مسیحائی بے سود کرم ہوگا
یہ دردِ محبت ہے مشکل ہی سے کم ہوگا

ایسی بھی ہنسی کیا ہے دیوانے کی حالت پر
آنسو نکل آئیں گے دامن ترا نم ہوگا

خوشیوں سے کے بہلانے ہی ٹکرانے دو شیشوں کو
یہ دل ہے بہر صورت مانوسِ الم ہوگا

تم خود ہی سمجھ لوگے مفہومِ وفا کیا ہے
تم کو بھی محبت میں اندازۂ غم ہوگا

سانسوں کا بھروسہ کیا دل ڈوبنے والا ہے
ایسے میں اگر تم بھی آؤ تو کرم ہوگا

نیّر! دلِ ویراں کو اُس وقت بھلا دینا
جس دن کوئی دیوانہ آسودۂ غم ہوگا

روز و شب کی کشمکش سے بے نیاز ہنا ہے کون
دوستوں سے بے تعلق اس طرح رہتا ہے کون

شاعرِ خوش فکر کی ذہنی رفاقت کے لیے
تم کو گاؤں کی فضا سے شہر میں لاتا ہے کون

وہ اگر میرے ہی پچھلے دور کا سایہ نہ تھا
پاؤں کی زنجیر بن کر ساتھ اب رہتا ہے کون

رفتہ رفتہ پھر مرے دامن تلک آ ہی گئی
شب کے سناٹوں میں اکثر بھیگتا رہتا ہے کون

دل کے دروازے پہ دستک کی طرح گر تم نہ تھے
رکھ کے سر زانو پہ میرے، رات بھر سوتا ہے کون

ذہن و دل کو پھر مرے مہکا رہی ہے زندگی
بن کے خوشبو کا سفر پھر میرے گھر آیا ہے کون

ہر طرف پھیلی ہوئی ہے ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی
اس اندھیرے گھر میں تیرا! رات بھر جلتا ہے کون

سلوکِ موسمِ باراں سے ڈر رہا ہوں میں
بھری بہار میں بھی چشمِ تر رہا ہوں میں

وہ ایک راہ جو زنجیرِ پا رہی برسوں
اُس ایک راہ سے اب بھی گزر رہا ہوں میں

شبِ جُدائی سے ہو جب بھی گفتگو کہنا
کبھی کبھی تو پیامِ سحر رہا ہوں میں

نہ میرے ہاتھوں میں سیندور ہے نہ افشاں ہے
یہ کچھ اِس طرح سے تری مانگ بھر رہا ہوں میں

پُرانی یادوں کو سینے میں دفن کرتے ہوئے
خود اپنے آپ پہ احسان کر رہا ہوں میں

جب اپنے آپ کی پہچان ہے بہت آساں
تو برگِ گُل کی طرح کیوں بکھر رہا ہوں میں

شعور مجھ کو بھی نیّرؔ ہے غم شناسی کا
تمہاری طرح کبھی دیدہ ور رہا ہوں میں

عکس خوابوں کا اُبھرتا ہے تو معدوم نہ کر
میرے مولا! تو مجھے نیند سے محروم نہ کر

ہو نہ جائے کہیں گھر سے ہی نکلنا مشکل
میرے شاعر تو مرے پیار کو منظوم نہ کر

ایک اک لمحہ ابھی صدیوں میں بدلا ہے کہاں
صبحِ روشن ہے ابھی صبح کو مرحوم نہ کر

اور کچھ دن تو رہائی کا بھرم رہنے دے
تو مری طرح کسی اور کو محکوم نہ کر

آج اک عمر کے بعد آئی ہے ہونٹوں پہ ہنسی
اور کچھ دن کے لیے تو مجھے مغموم نہ کر

تجھ کو ملبے کے سوا کچھ نہ ملے گا نیّر!
میں کہاں رہتا ہوں کس گھر میں ہوں معلوم نہ کر

حیدرآباد ہوں میں میرے مقابل تُو ہے
میری جھکی ہوی تہذیب کا قاتل تُو ہے

کون اب روکے گا بڑھتے ہوئے طوفانوں کو
تجھ کو اندازہ نہیں ہے لبِ ساحل تُو ہے

کتنے دُھندلائے ہوئے ہیں ترے چہرے کے نقوش
آئینہ دیکھ تو لے کس کے مقابل تُو ہے

ہر نئی صبح، نئی شکل دکھاتا ہے ہمیں
جانے کن لوگوں میں اک عمر سے شامل تُو ہے

کتنے آثار مٹا ڈالے نئے نام کے ساتھ
پہلی اور آخری اس شہر کی مشکل تُو ہے

کل کوئی چھین کے لے جائے گا مسند تیری
خوش نہ ہونا کہ ابھی زینتِ محفل تُو ہے

سب کے سب شہر میں لاعلم ہیں نیرؔ کی طرح
جانے کس محفلِ بے نام کا حاصل تو ہے

یہ حالت نہ ہرگز اسیروں کی ہوتی
حکومت اگر ہم فقیروں کی ہوتی

بہت پہلے تم کو بھی میں ڈھونڈ لیتا
یہ بستی اگر با ضمیروں کی ہوتی

کھلے سر تری بزم میں ہم بھی ہوتے
یہ مانا کہ برسات تیروں کی ہوتی

چمن سے نہ اتنے کبھی پھول چنتا
کلائی اگر تیری ہیروں کی ہوتی

قلندر کی صورت یہاں بیٹھ جاتا
چٹائی اگر یہ بھی پیروں کی ہوتی

کہو بند کیوں ہیں ہتھیلی کو رکھتا
اگر اچھی قسمت لکیروں کی ہوتی

میں رکتا یہاں پر بھی کچھ دیر نیر!
یہ منزل اگر راہ گیروں کی ہوتی

احسان کہاں پھولوں پہ شبنم نے کیا ہے
یہ جرم بھی اک دیدۂ پرنم نے کیا ہے

آئینے نظر آتے ہیں پتھراؤ کی زد میں
کیا جانئے کیا رشتۂ باہم نے کیا ہے

پورا نظر آیا نہ کبھی چاند سا چہرہ
اتنا تو یہاں گیسوئے برہم نے کیا ہے

ہمراہ رہیں یوں تو تبسم کی لکیریں
افسردہ تو اندیشۂ ماتم نے کیا ہے

جاؤں گا کہاں آپ کی چوکھٹ سے میں اٹھ کر
یہ حال مرا آپ کے ہی غم نے کیا ہے

کب تک یونہی ہم آنکھیں چراتے رہیں نیّر
تہذیب کو رسوا تو یہاں ہم نے کیا ہے

زلفیں ہیں بکھری بکھری سی چہرہ اداس ہے
کیا جانے کتنی عمر کی آنکھوں میں پیاس ہے

کروٹ بدل رہی ہے ابھی زندگی کی لاش
قاتل سے کوئی کہہ دے ابھی تھوڑی آس ہے

کتنے ہی پھول صحنِ چمن میں کھلے مگر
اِک گوشہ گلستاں کا ابھی تک اُداس ہے

تیری خموشیوں سے نہ کیوں دل مہک اُٹھے
جب تیری گفتگو میں بھی پھولوں کی باس ہے

کیا مصلحت شناس ہیں اِس میکدے کے لوگ
اب تک ہمارے ہاتھوں میں خالی گلاس ہے

ہم بھی تو وضع داری پہ قائم ہیں آج تک
نیّر! نگاہِ دوست اگر خود شناس ہے

زینتِ شہرِ وفا، فخرِ جہاں ہیں کچھ لوگ
نقش ڈھندلے ہی سہی، سجدہ کناں ہیں کچھ لوگ

صاف گو، پاک نظر، نرم زباں ہیں یہ کچھ لوگ
طبعِ نازک پہ مگر پھر بھی گراں ہیں یہ کچھ لوگ

شمعِ احساس کی لو اور ذرا تیز کرو
دور رہ کر بھی قریبِ رگِ جاں ہیں کچھ لوگ

آپ کی میری وفاؤں کا یہاں ذکر ہی کیا
مٹ گئے ایسے کہ قدموں کے نشاں ہیں کچھ لوگ

اپنی مرضی سے نہ ہنستے ہیں نہ رو سکتے ہیں
آپ کی بزم میں ایسے بھی یہاں ہیں یہ کچھ لوگ

جیتے جی اُن کا کبھی نام نہ لوں گا تیرا!
خونِ تازہ کی طرح دل میں رواں ہیں کچھ لوگ

آنکھوں کے پھیلے کاجل کو اپنا کہہ کر میں پچھتایا
ان پلکوں کے نیل کنول کو اپنا کہہ کر میں پچھتایا

محفل چپ چپ گم صم، گم صم، ہر سو ہے اک سناٹا سا
تیری بزم کے ایک اک پل کو اپنا کہہ کر میں پچھتایا

میں ہوں اک فنکار، مصور، مفلس شاعر آوارہ سا
شاہجہاں کے تاج محل کو اپنا کہہ کر میں پچھتایا

پاؤں ہیں زخمی، راہ کٹھن ہے، منزل منزل کوہ گراں
راس کماری، بندھیاچل کو اپنا کہہ کر میں پچھتایا

محفل محفل، تنہا تنہا، دیوانے کا کوئی نہیں ہے
بھولے من پنچھی پاگل کو اپنا کہہ کر میں پچھتایا

آس کا گلشن سونا سونا، دل کا دامن خالی خالی
ہونٹوں کے شاداب کنول کو اپنا کہہ کر میں پچھتایا

اپنے ہی آنسو اپنی ہی پلکیں کوئی نہ آنچل کوئی نہ دامن
پھر بھی نیر جانِ غزل کو اپنا کہہ کر میں پچھتایا

کل شب تمہارا روٹھ کے جانا نیا نہ تھا
تم کو منا کے لانا ہمارا نیا نہ تھا

کچھ تشنگی کا ہو نہ سکا تم سے تجزیہ
مانا کہ روشنی کا یہ پیاسا نیا نہ تھا

راتوں کا زہر پی کے نئی صبح کے لیے
یوں تیرا جاگ کے رونا نیا نہ تھا

ٹوٹا کبھی نہ خانہ بدوشوں سے سلسلہ
میرے لیے تمہارا قبیلہ نیا نہ تھا

جو جا چکے ہیں لوٹ کے آتے نہیں مگر
آہٹ پہ کان دھرنا تمہارا نیا نہ تھا

زندانِ غم سے پاؤں کی زنجیر توڑ کر
تیرا کھلی فضاؤں میں اڑنا نیا نہ تھا

صدیوں سے کر رہا ہے اندھیروں سے گفتگو
نیترؔ! ہمارے گھر کا اُجالا نیا نہ تھا

اُس انجمن ناز میں، میں جاتا تو رہا ہوں
خاموش محبت کی سزا پا تو رہا ہوں

مانا تری محفل میں اُجالا نہیں ہوتا
ہر رات تری بزم میں جلتا تو رہا ہوں

اس شہر کی گلیوں میں کسی دوست کی خاطر
خوشبوئے وفا بن کے بھٹکتا تو رہا ہوں

خاموش اِسی طرح کئی دن سے ہوں لیکن
اِس زہر کا کیا نام ہے پیتا تو رہا ہوں

خوشبوئے ملاقات کا احساس دلا کر
میں انجمنِ دوست کو مہکا تو رہا ہوں

نیّرؔ! کبھی تم اُس "گُلِ تازہ" سے یہ کہنا
ہر سانس میں خوشبوئے وفا پا تو رہا ہوں

ہیں کیسے کہہ دوں اِس انجمن میں کہیں کوئی دیدہ ور نہیں ہے
شعورِ حسنِ نظر ہے لیکن نظر ابھی معتبر نہیں ہے

کسی کے نقشِ قدم پہ چلنا خود اعتمادی کی موت ہوگی
بجز مری لغزشوں کے یارو! کوئی مرا راہبر نہیں ہے

ابھی زباں آشنا نہیں ہے خلوصِ اظہارِ آرزو سے
ابھی ابھی ہاتھ اٹھے ہیں میرے ابھی دعا معتبر نہیں ہے

ازل کا صحرا نصیب ہوں میں کہاں مجھے کھینچ لائے ہو تم
قدم قدم پر ہیں پھول تازہ مری تو یہ رہ گزر نہیں ہے

نہ کوئی ساتھی نہ کوئی مونس، چلا ہوں چلتا ہی جا رہا ہوں
سوائے احساسِ قربِ جاناں! کوئی مرا ہم سفر نہیں ہے

تمہارے نقشِ قدم سمجھ کر کہاں کہاں سر جھکایا میں نے
شعورِ سجدہ سے ہے شکایت، شکایتِ سنگِ در نہیں ہے

جو میرے ہونٹوں پہ تھیں وہ باتیں نظر سے اُن کی ادا ہوئی ہیں
زبانِ احساس ہے یہ نیّر! روایتی نامہ بر نہیں ہے

اِس طرح ہو رہی ہے بسر حادثات میں
دن کو قلم ہے رات کو تلوار ہات میں

پھولوں سے گفتگو کا زمانہ گزر گیا
خنجر زنی کا راج ہے شہرِ نجات میں

سب قاتلوں کو اچھی طرح جانتا ہوں میں
کس کس کا نام لکھو گے اِس واردات میں

اک سلسلہ تھا درد کا وہ ختم ہو گیا!
اب فاصلہ ہی کیا رہا موت و حیات میں

انصاف کیا کریں گے فقیہانِ شہر اب
فرق آ گیا ہے جب نگہِ التفات میں

نیّر! اندھیرے اور بھی بڑھتے رہیں تو کیا
ہے روشنی کا اب بھی چلن اپنی ذات میں

درد آشنا ہے پھر بھی محبت خموش ہے
دل بھی غمِ حیات کا حلقہ بگوش ہے

کتنی ادا شناس محبت ہے چشمِ دوست
جو پاسدارِ غم تھی وہی پردہ پوش ہے

لوٹا گیا ہوں کونسی راہوں میں کیا پتہ
تم تھے مرے رفیقِ سفر اتنا ہوش ہے

کیا جانے چشمِ دوست سے کیا بھول ہو گئی
دل پہلے بولتا تھا مگر اب خموش ہے

پہچان لوں گا اپنے قبیلے کے لوگ ہیں
دیوانگی میں دوستو! اتنا تو ہوش ہے

پھولوں کا خون پی کے ہوا اور تازہ دم
گلشن کا غنچہ غنچہ تبسّم فروش ہے

نیّر! وہ آنسوؤں کے سوا اور کچھ نہیں
دیوانہ جن کو پی کے ابھی تک خموش ہے

مجھے اپنی تباہی کا پتہ ہے
تمہارے ساتھ کیا دھوکا ہوا ہے

زمانہ زندگی کا زہر دے کر
پتہ مجھ سے اجل کا پوچھتا ہے

جو پیمانہ کبھی رندوں کا دل تھا
سر مے خانہ اب ٹوٹا پڑا ہے

مری تنہائیاں مجھ سے نہ چھینو!
مرے ہاں ویسے بھی اب کیا رہا ہے

اجل سے زندگی کے راستے تک
محبت درمیانی فاصلہ ہے

جو اٹھوایا گیا محفل سے تیری
زمانہ اُس کو اب تک ڈھونڈتا ہے

بہت تاخیر کی آنے میں نیّرؔ!
مری دنیا میں اب کیا رہ گیا ہے

خلوصِ عشق کو احساس میں سموتے ہیں
دِلوں کے رشتے بہت ہی لطیف ہوتے ہیں

میں اپنے دوست کی تصویر دیکھ لیتا ہوں
بچھڑنے والے گلے مل کے جب بھی روتے ہیں

یہ کچھ اشک رکتے ہیں جب نامراد پلکوں پر
دلوں کے ریشمی اوراق کو بھگوتے ہیں

وہ بوالہوس ہیں جو آسودگی کے دھوکے میں
تمام عمر گناہوں کا بوجھ ڈھوتے ہیں

یہ قیدِ ہوش تمنا تھی مسکرانے کی

مگر ہم ایک تبسم کو اب بھی روتے ہیں

خبر نہیں یہ وفا کی ہے کونسی منزل
نہ کھل کے ہنستے ہیں نیتر نہ کھل کے روتے ہیں

ہیں دیر و حرم کم یہاں، میخانے بہت ہیں
لگتا ہے کہ اِس شہر میں دیوانے بہت ہیں

مے نوشی کا اعزاز مقدر سے ملا ہے
ہم کو تری آنکھوں ہی کے پیمانے بہت ہیں

اِس دورِ ہوس میں کوئی آذر نہیں ملتا
شیشے کے گھروں میں بھی صنم خانے بہت ہیں

کس شہر کی مٹی ہے ہمیں کچھ نہیں معلوم
اِس فرش پہ ٹوٹے ہوئے پیمانے بہت ہیں

چلنے کا سلیقہ ہے تو دو چار قدم اور
صحرا کا بھرم رکھنے کو ویرانے بہت ہیں

یہ رسمِ جنوں کم نہیں ہوگی کبھی نیّر!
ہم جیسے ابھی شہر میں دیوانے بہت ہیں

ابھر کے آئے ہیں کانٹوں کے زخم پتھر پر
یہ کیسے پھول کھلے فصلِ گل کی چادر پر

مجھے ہنسی کی تمنّا میں مبتلا نہ کرو
غموں کو چھوڑ کے آیا ہوں اپنے ہی گھر پر

بہت سے نام تو کتبوں کی بن گئے زینت
میں کس کا نام لکھوں راہ کے پتھر پر

پڑوسیوں ہی کے پتھراؤ سے ہوئے زخمی
لگی ہے گہری سی اک چوٹ اپنے بھی سر پر

یہ کیا عذاب ہے جب خواب چھن گئے اپنے
تو نیند آئی نہ ہم کو گلوں کے بستر پر

تمام تہمتیں پہلی جرح میں ٹوٹ گئیں
لگائے کتنے ہی الزام تم نے نیتر پر

ہراک ادا تیری مائل بہ دلنوازی ہے
مرے رفیق! کہاں تجھ میں بے نیازی ہے

حیات، زخم بنی، زخم بن گئے ناسور
نفس نفس مرا محتاجِ چارہ سازی ہے

گناہگار ہوں میں مجرمِ وفا تو نہیں
پھر اس کے بعد بھی کب تابِ پاکبازی ہے

ہم ایسے لوگ بھی گلیوں سے دار تک پہنچے
خلوصِ عشق! یہ سب تیری سرفرازی ہے

چلے بھی آؤ کہ تجدیدِ آرزو کر لیں
وفا کی بزم میں ہاری ہوی یہ بازی ہے

بہ جز خلوص، ہراک جنس ہوگئی ارزاں
جہاں بھی جاؤ رفیقو! زمانہ سازی ہے

وفا شعار جو تھے مصلحت شناس بنے
ہمارے دور کی نیرنگ! یہ کارسازی ہے

اے رہ نوردِ شوق ! ذرا دیکھ بھال کر
کانٹے بچھے ہوئے نہ ہوں پھولوں کی سیج پر

اب تک ہیں زخم تازہ ہماری نگاہ کے
ڈالی تھی زندگی پہ اُچٹتی ہوئی نظر

جز چشمِ نم، نہیں ہے کوئی تحفہ میرے پاس
اشکوں کے پھول لایا ہوں ان کو قبول کر

تم پاس تھے تو آنکھوں میں تھی کتنی روشنی
تم سامنے سے ہٹ گئے ویراں ہوئی نظر

وہ لمحۂ وفا جو بہت مختصر سہی
برسوں کی ہے امانت اُسے رکھ سنبھال کر

تجھ میں جمالِ دوست کا احساس کم نہ ہو
نیّر تو اپنی ذات سے اِتنا نہ پیار کر

کون آنے والا ہے کس نے زلف لہرا دی
اس قدر نہ کتنی پہلے شہرِ دل میں آبادی

درد و غم کی راہوں سے کتنے فاصلے گزرے
پھر بھی کتنی ویراں ہے شاہراہِ آزادی

کس سے حالِ دل کہیے کون سننے والا ہے
زندگی کا ہر لمحہ بن گیا ہے فریادی

بھیگی بھیگی پلکیں ہیں محوِ گفتگو کب سے
ہنستے ہنستے ہونٹوں نے چھین لی ہے آزادی

اپنے حال پر بھی ہم مسکرا نہیں سکتے
زخم سہتے سہتے ہم اتنے ہو گئے عادی

اُس کے درد کو سمجھیں آؤ نیّرِ تاباں
آج بھی اکیلی ہے حسرتوں کی شہزادی

یہ مانا زندگی خود حادثوں کی آزمائش ہے
مگر ان حادثوں میں بھی ہمیں جینے کی خواہش ہے

جہاں تہذیبِ گلشن میں رہی کانٹوں کی ہمدردی
وہاں بربادیٔ گلشن میں پھولوں کی بھی سازش ہے

کئی موسم بہ اندازِ خزاں آئے گئے لیکن
نگارِ زندگی پر آج بھی پھولوں کی بارش ہے

مسلسل کرب میں کچھ وقفۂ راحت بھی ملتا ہے
مری محرومیوں کی مجھ پہ یہ بھی اک نوازش ہے

ہمارا نام بھی اوراقِ گُل پر خون سے لکھ دو
چمن والو! ہماری ایک چھوٹی سی گزارش ہے

چلو نیّر! سجا دیں ہم بھی اپنے دل کے زخموں کو
سُنا ہے محفلِ یاراں میں زخموں کی نمائش ہے

آتشِ غم سے خوش نصیب جلے
دُور رہ کر بہت قریب جلے

آتشِ گُل سے کیا شکایت ہو
اپنے نغموں سے عندلیب جلے

اپنی محفل میں تم کو پا نہ سکے
ہم بھی ہیں کس قدر نصیب جلے

صبح کی تازہ روشنی کے لیے
رات بھر شاعر و ادیب جلے

آگ بھڑکی نہ کچھ دھواں ہی اٹھا
عمر بھر یوں ہی غم نصیب جلے

اونچے محلوں کی روشنی کے لیے
اجنبی شہر میں غریب جلے

رات بھر شمع کی طرح نیرؔ!
اُن کی محفل میں غم نصیب جلے

جب ترے غم میں دیوانہ مر جائے گا
ہم نشیں! وقت کا دل ٹھہر جائے گا

کاسۂ چشم خالی ہوا بھی تو کیا؟
تیرا دامن بہر حال بھر جائے گا

جس قدر رات کی پلکیں بھیگا کریں
صبح کا چہرہ اتنا نکھر جائے گا

فکرِ مرہم نہ کر اے محبت نواز
زخمِ دل ایک دن خود ہی بھر جائے گا

جھک گئیں شامِ غم میری پلکیں مگر
حسنِ شب اور بھی تو سنور جائے گا

بزم سے اُن کی نیّر! تم اُٹھ تو گیا
یہ نہ سوچا کہ آخر کدھر جائے گا

جرمِ الفت کی سزا دانستہ دے جاتے ہیں لوگ
پیار کرتے ہیں مگر ملنے سے گھبراتے ہیں لوگ

بزمِ ساقی میں اگر چشمِ کرم خاموش ہو
اپنے آنسو اپنا دامن ساتھ لے جاتے ہیں لوگ

کس کا دل ٹوٹا ہے تم کو اس کا اندازہ نہیں
لمحہ لمحہ بن کے صدیوں تک بکھر جاتے ہیں لوگ

تہمتِ دیوانگی جب میکدے میں عام ہو
زندگی کا زہر، خاموشی سے پی جاتے ہیں لوگ

فاصلہ قربت کی اک بدلی ہوئی سی شکل ہے
دل گرفتہ ہو کے محفل سے کہاں جاتے ہیں لوگ

قصۂ مہر و وفا، وجہ سکونِ دل سہی
رفتہ رفتہ آنسوؤں کی زد میں آجاتے ہیں لوگ

جانتے ہیں وہ بھی پیرا کیا ہیں آدابِ وفا
رکتے رکتے پاس آکر پھر بھی گھبراتے ہیں لوگ

تنہائی کے عالم میں مرے پاس رہی ہے
وہ یاد جو احساس کے سانچوں میں ڈھلی ہے

اِس بزم میں سب کچھ ہے مگر تیری کمی ہے
کب سے نگہِ شوق تجھے ڈھونڈ رہی ہے

گلزار میں ہر ایک کلی جاگ رہی ہے
خوشبو ترے انفاس کی پھولوں میں بسی ہے

رہتی ہے نظر سب کی چراغِ سحری پر
اُس شمع کا کیا ہو جو ہر شام بجھی ہے

گُل ہو گئیں شمعیں، مہ و انجم ہوئے رخصت
لَو شمعِ تمنّا کی مگر جاگ رہی ہے

شعلے ہوئے رقصاں نہ دھواں ہی نظر آیا
ایسی بھی تری بزم میں اک شمع جلی ہے

جب اشک ہی پلکوں کو میسّر نہیں نیّرؔ!
کیوں دامنِ دل میں مرے پھر آگ لگی ہے

ہمیں سے روشنی ہے میکدوں کی راہوں میں
ہمیں نے شمعیں جلائی ہیں قتل گاہوں میں

نہ جانے کب سے مسلسل ٹپک رہا ہے لہو
بہت سے زخم ہیں تہذیب کی نگاہوں میں

جو اپنے آپ کو کہتے تھے روشنی کا نقیب
بھٹک رہے ہیں وہی تیرگی کی راہوں میں

انھیں کی آنکھوں سے لوگوں نے روشنی چھینی
چراغ بن کے جلے تھے جو خوابگاہوں میں

چلو یہاں سے کہیں اور چل کے بیٹھیں گے
یہاں تو کوئی نہیں اپنے خیرخواہوں میں

سوال بن گئے جو تاجِ خسروی کے لیے
کچھ ایسے لوگ بھی نیّر ہیں کج کلاہوں میں

یہ جانتے ہوئے ہم کو ملیں گے زہر کے پھول
خوشی سے کر لیے پھر بھی بطورِ نذر، قبول

نہ آیا فرق کبھی شانِ کج کلاہی میں
بدل سکے نہ کبھی اپنی زندگی کے اصول

مٹا مٹا کے ترا نام لکھتا رہتا ہوں
یہ ایک کام ہے اب میرے روز کا معمول

مسرتوں کا ہمیں امتیاز کر نہ سکے
تمام عمر رُلاتی رہی ذرا سی بھول

جو زخم بھر گئے اُن کو کریدتے کیوں ہو
جو بات ختم ہوئی اُس کا تذکرہ ہے فضول

سیا نہ اپنا گریباں، مگر وہ دیوانہ
کسی کے زخموں کے دھوتے میں ہو گیا مشغول

اُسی کے پیار میں کرتا ہوں شاعری نیّر!
وہ ایک شخص جو شہرِ غزل میں ہے مقبول

دیر ہوئی تو پیاس بڑھے گی بند ہوا میخانہ کیا
ساقی کا بھی ہاتھ ہے خالی ٹوٹ گیا پیمانہ کیا

تم خود سب سے لڑکے گئے تھے ہم نے بہت سمجھایا تھا
اب کے برس جب گھر لوٹے تو سب نے تمہیں پہچانا کیا

خون کا بدلہ خون یہاں پر برسوں کی ہے رسم یہی
آپ کے گھر انصاف نہ ہو تو قاتل کے گھر جانا کیا

دستِ دعا خاموش ہیں کب سے ہونٹوں پر ہے سناٹا
آنسو ہی جب خشک ہوئے ہیں دامن کو پھیلانا کیا

اپنا اپنا درد ہے لیکن غم کی دولت پیاری ہے
بیتے ہوئے لمحوں کی کہانی محفل میں دہرانا کیا

ذہن و دل میں الجھن سی ہے سوچ میں بیٹھے ہیں نیر
صبح کو جب ہم گھر لوٹیں گے سبھی کو سمجھانا کیا

تم کو نفس نفس میں مسرت کی ہے تلاش
لیکن مری حیات کے نغمے ہیں دلخراش

آئینے حسرتوں کے یہاں کرکے پاش پاش
پتھر کے دل میں بیٹھ گیا ہے صنم تراش

کس دشمنِ وفا کی نگاہیں بہک گئیں
سہوِ نظر سے ہو گیا برسوں کا راز فاش

اِس روشنی کے دور میں یہ آج کا سماج
تہذیبِ نو کے دوش پہ ہے زندگی کی لاش

باقی حیات ہوتی نہ رسوا گلی گلی
تھوڑا سہارا دیتے اگر تم ہی مجھ کو کاش

سب کو کہاں نصیب ہے نیرؔ نشاطِ غم
اِک میں ہی ہوں کہ رہتی ہے غم کو مری تلاش

نظر میں خونِ بہاراں ہے تم بھی ساتھ رہو
حیات، سر بہ گریباں ہے تم بھی ساتھ رہو

ٹپک رہی ہیں رگِ دل سے خون کی بوندیں
ہر ایک زخم فروزاں ہے تم بھی ساتھ رہو

نہ جانے کونسی منزل پہ آکے ٹھہرا ہوں
دل آج اور پریشاں ہے تم بھی ساتھ رہو

اُداس رات ہے تنہائیاں سُلگتی ہیں
اکیلی شمعِ شبستاں ہے تم بھی ساتھ رہو

جو یاد، زخمِ تمنّا کی آبرو تھی کبھی
وہ یاد قُربِ رگِ جاں ہے تم بھی ساتھ رہو

بھٹکنا ہے تو چلے آؤ ساتھ ساتھ چلیں
ہر ایک لمحہ گریزاں ہے تم بھی ساتھ رہو

تمام عمر رہی جس کی جستجو نیّر!
یہی وہ شامِ غریباں ہے تم بھی ساتھ رہو

کیا مصلحت تھی شاملِ ماتم نہ ہو سکے
پھر بھی ہم آپ سے کبھی برہم نہ ہو سکے

اپنی گرفت میں رہے لمحاتِ زندگی
حالات کا شکار کبھی ہم نہ ہو سکے

اعجازِ حُسن ہے کہ نظر کا فریب ہے
آسودۂ جمال کبھی ہم نہ ہو سکے

ہم آنسوؤں سے لکھتے رہے سرگزشتِ دل
اوراقِ زندگی جو فراہم نہ ہو سکے

موتی بنے، شرر بنے، شبنم بنے کبھی
آنسو ہمارے وقفِ شبِ غم نہ ہو سکے

جب آپ ساتھ تھے تو منزل بھی ساتھ تھی
تنہا چلے تو فاصلے پھر کم نہ ہو سکے

نیّر! اک اُن کا غم ہی نہیں حاصلِ حیات
کچھ اور غم بھی تھے جو فراہم نہ ہو سکے

یوسف ہوں محبت کا خریدار نہیں ہوں
میں اپنی جگہ بزم ہوں بازار نہیں ہوں

جب بھیگتی ہیں پلکیں تو بڑھتے ہیں خود آنچل
ایسے کسی دامن کا طلب گار نہیں ہوں

کچھ ربط ہی ایسا ہے چلا آیا ہوں خود ہی
تم یہ نہ سمجھنا کہ میں خوددار نہیں ہوں

احساسِ تکلّم ہے نگاہوں کے حوالے
کچھ دن سے میں آمادۂ گفتار نہیں ہوں

میں دیکھ لیا کرتا ہوں آنکھوں کو تمہاری
جب رند یہ کہتے ہیں کہ میخوار نہیں ہوں

زخموں سے تو پھولوں میں اضافہ ہی ہوا ہے
میں باعثِ ویرانیٔ گلزار نہیں ہوں

چاہت کا صلہ گوشۂ تنہائی ہے نیّر!
میں آج خود اپنا بھی پرستار نہیں ہوں

اب کہاں ملتے ہیں ہر بات کو سہنے والے
ہائے! کیا لوگ تھے اِس شہر کے رہنے والے

صرف اشکوں کا اُنھیں نام نہ دینا یارو
دِل کے جذبات بھی ہیں آنکھوں سے بہنے والے

گھر سے نکلے تو ہوا خانہ بدوشوں میں شمار
ہم بھی تھے آپ کے ہی شہر کے رہنے والے

وضع دار آپ کو اب ایسے کہاں ملتے ہیں
ہر بُری بات کو بھی ٹھیک ہے کہنے والے

سر جھکائے ہوئے خاموش کھڑے ہیں کب سے
دل کے احوال کو آنکھوں ہی سے کہنے والے

ہم تو حالات سے مسکراتے رہیں گے نیّر!
ہم نہیں وقت کے طوفان میں بہنے والے

وفا کا زہر بھی شامل ہے بے پرستی میں
جئیں تو کیسے جئیں قاتلوں کی بستی میں

ترا اپنا ہاتھ ذرا سوچ کر بڑھا دینا
بہت سے ہاتھ کٹے ہیں دراز دستی میں

نہ جانے کب سے صلیبوں سے اپنا رشتہ ہے
زبان کٹ گئی یاروں کی حق پرستی میں

متاعِ درد سی نعمت بھی آج پاس نہیں
ترا خیال بھی آیا تو تنگ دستی میں

اگرچہ صبر و قناعت کا پاس ہے لیکن
قلندری بھی غنیمت ہے فاقہ مستی میں

وہ خود ہی پیش کریں زندگی کا نذرانہ
جو مبتلا ہیں زمانے سے خود پرستی میں

بہت سے شہروں میں ڈھونڈا کہیں پتہ نہ چلا
سنا ہے رہتے ہیں نیّر تمہاری بستی میں

دلِ و نگاہ کا شیرازہ جب بکھرتا ہے
وفا شناس بھی رسوائیوں سے ڈرتا ہے

بہ قدرِ ظرف ابھی مے کشوں کو پینے دو
رُخِ حیات سے خود ہی نقاب اُترتا ہے

جمالِ دوست کئی آئینوں سے چھن چھن کر
غمِ حیات کے سانچوں میں رنگ بھرتا ہے

انا پسند مزاجوں پہ طنز کیا کیجے
خودی کا نشہ بہت دیر سے اُترتا ہے

یہ کیسا جُرمِ وفا ہے کہ کوئی دیوانہ
نہ بھول سکتا ہے تم کو نہ یاد کرتا ہے

نگاہ ملتے ہی ہاتھوں سے جام چھوٹ گئے
تری نگاہ میں اِک دور رقص کرتا ہے

خود اپنی دھڑکنیں ہوتی ہیں اجنبی نیّر!
دلِ غریب پہ وہ وقت بھی گزرتا ہے

میں اجنبی ہوں ابھی مجھ سے اتنا پیار نہ کر
تمام عمر مجھے وقفِ انتظار نہ کر

اگر ہے ظرف تو اشکوں کو پی مگر اے دوست
کسی کے گوشۂ دامن کا انتظار نہ کر

تو جانتا ہے کہ میں بھی ہوں برگِ آوارہ
سکون چاہنے والوں میں اب شمار نہ کر

خبر بھی ہے تجھے موسم بدلتے رہتے ہیں
چمن میں صرف بہاروں کا انتظار نہ کر

کبھی تو اپنی بھی لغزش سے کام لیتا جا
ہر ایک گام پہ رہبر کا اعتبار نہ کر

چراغِ محفلِ انجم بھی بجھ گئے نیتر!
اب اس کے بعد کسی کا بھی انتظار نہ کر

میری آنکھوں میں تو دیکھو کب سے میں بیدار ہوں
سل گئے ہیں ہونٹ پھر بھی میں لبِ اظہار ہوں

گاہے گاہے دیکھ لینا اونچے محلوں کی طرف
میرا کیا ہے میں تو اک گرتی ہوی دیوار ہوں

آپ سے شکوہ کروں اِتنی کہاں فرصت مجھے
اپنے خود حالات سے میں برسرِ پیکار ہوں

دوستوں کی بھی نظر ہے کج کلاہی پر مری
جرم یہ ہے پاسبانِ کوچۂ دلدار ہوں

میں ہی خود دوچار ہوں بے ربطیٔ حالات سے
مجھ پہ یہ الزام ہے ٹوٹا ہوا اقرار ہوں

میرا دامن تو سلامت ہے نہ جانے کس لیے
کون سے الزام میں رسوا سرِ بازار ہوں

جن کی قسمت میں ہیں نیرؔ ان گنت محرومیاں
خوش نصیبی ہے کہ ایسے دور کا فن کار ہوں

خرد کے ہم سفر جب بھی مری دیوانگی ہوگی
میں جس رستے سے گزروں گا تمہاری ہی گلی ہوگی

ابھی تک بزمِ دل کے بعض گوشوں میں ہے تاریکی
تم آجاؤ تو میرے گھر میں ہر سو روشنی ہوگی

غریبِ شہر کی محرومیوں کو دل سے لپٹا کر
مری دیوانگی شاید ترے در پر کھڑی ہوگی

کبھی آنکھوں میں میری بے سبب آنسو نہیں آتے
تری پلکوں سے کوئی قیمتی شے گر گئی ہوگی

فضا ہو پُرسکوں تو کیا مگر اک شمعِ بے چاری
سلگتی رات کے دامن میں تنہا جل گئی ہوگی

بھٹکتے ہوں گے جب شہرِ غزل میں آ کے دیوانے
مری رسوائی تیرا نام لے کر پوچھتی ہوگی

سحر ہونے کے بعد آنے سے نیر فائدہ کیا ہے
وہ چشمِ نم بھی اب مایوس ہو کر سو گئی ہوگی

آتشِ نغمہ سلامت! کہیں گلشن نہ جلے
گرمیِ آہ سے بھیگا ہوا ساون نہ جلے

آپ دامن نہ بڑھائیں مرے اشکوں کے لیے
میرے اشکوں سے کہیں آپ کا دامن نہ جلے

شاخِ گل کی طرف اِس طرح بڑھے دستِ حسیں
پھول کے جسم جلے آپ کے کنگن نہ جلے

دیر تک عارضِ گلنار پہ گھونگھٹ نہ رہے
گرمیِ حُسن سے ڈر ہے کہیں دُلہن نہ جلے

آپ مصروفِ تماشا ہیں تو رہیے لیکن
آپ کے دستِ حنائی سے یہ چلمن نہ جلے

پھول جیسے یہ قدم اور یہ تکلیف خرام
آپ کے پاؤں کی مہندی سے یہ آنگن نہ جلے

میں اِسی سوچ میں رہتا ہوں ہمیشہ نیّر!
ہجر کی آگ میں اِک دن کہیں جوگن نہ جلے

چراغِ دردکو مدھم نہ کیجے
حیاتِ دل کو اتنا کم نہ کیجے

ابھی میں پیار کے قابل نہیں ہوں
ابھی مجھ کو شریکِ غم نہ کیجے

بہت گہرے ہیں زخمِ زندگانی
ابھی منت کشِ مرہم نہ کیجے

ابھی اوراقِ دل جوڑے ہیں میں نے
مری دنیا کو پھر برہم نہ کیجے

انھیں کانٹوں سے بھی وابستگی ہے
گلوں کو وارثِ شبنم نہ کیجے

ابھی تو ابتدا ہے داستاں کی
ابھی پلکوں کو میری نم نہ کیجے

"گلِ تازہ" کو اپنی طرح نیّر!
کبھی مانوسِ دردوغم نہ کیجے

زندگی یوں تو ہماری اک شکستہ ساز ہے
سننے والوں کے لیے آواز ہی آواز ہے

کونسی منزل پہ آ کر تھم گیا دردِ جگر
آج دل کی انجمن، محرومِ سوز و ساز ہے

اب تو میری سانس بھی مجھ پر گراں ہونے لگی
زندگی تو ہی بتا یہ کون سا انداز ہے

کیسے گیسوں کو سرِ بازار رسوا کر دیا
اے مزاجِ حسن! تیرا یہ بھی اک اعجاز ہے

غالباً ٹوٹا ہے نیّر! پھر کوئی تارِ نفس
دور تک آواز ہے آواز ہی آواز ہے

پاکیزہ نظر باعثِ رسوائی کہاں ہے
آنکھوں پہ مری تہمتِ بینائی کہاں ہے

کچھ پھول ابھی چشمِ ندامت سے گرے ہیں
تا حدِّ نظر میں نے سزا پائی کہاں ہے

الجھی ہے سرِ راہ نسیمِ سحری سے
بجلی سرِ گلشن ابھی لہرائی کہاں ہے

مجھ پر نگہِ شوق کا احسان ہے لیکن
ان آنکھوں میں اندازِ پذیرائی کہاں ہے

مقتل میں حیاتِ ابدی ڈھونڈنے والو!
اب تم میں وہ احساسِ مسیحائی کہاں ہے

بھیگے ہوئے ہونٹوں پہ ہنسی دیکھنے والو!
تم کو مرے زخموں سے شناسائی کہاں ہے

جب خوش نظری دوست کی تمہیدِ وفا ہو
نیّر! یہ ادا باعثِ رسوائی کہاں ہے

پھول جتنے تھے شگفتہ، سرِ بازار گرے
ایک یوسف کے لیے کتنے خریدار گرے

ایک زخم اور سہی، خون بہت سستا ہے
اِس سے پہلے کہ ترے ہاتھ سے تلوار گرے

کٹ گئے ہاتھ لہو جم گیا بنیادوں میں
کس بلندی سے مرے شہر کے معمار گرے

حوصلہ ہم میں تھا طوفانوں سے ٹکراتے رہے
جو سبک جسم تھے وہ جھیل کے اُس پار گرے

وادیٔ گُل میں لُٹا جب کبھی پھولوں کا سہاگ
زلزلے آئے کئی ٹوٹ کے کہسار گرے

جب تلک راہ کا پتھر نہ بنے تھے نیّر
ایک ٹھوکر میں بھی ہم لوگ کئی بار گرے

میں یہ کب کہتا ہوں اتنا بھی ستم کوش نہ ہو
آدمی کچھ بھی ہو احسان فراموش نہ ہو

میرے ساغر میں ہے ساقی کی نگاہوں کا بھرم
شمعِ احساس سے کہہ دو ابھی خاموش نہ ہو

کتنے لمحوں کو سمیٹے ہوئے آئی ہے بہار
یہ بھی رُت پھولوں کی ڈرتا ہوں کفن پوش نہ ہو

میرے حالات بڑے شوق سے لکھو لیکن
کوئی لمحہ مرے ماضی کا فراموش نہ ہو

اپنی آنکھوں سے مجھے اتنی پلا دے ساقی
تیری مخمور نگاہوں کے سوا ہوش نہ ہو

حُسنِ سادہ کو ترستی ہیں نگاہیں نیّر
پسِ پردہ ہی سہی ہم سے وہ روپوش نہ ہو

فریاد بن کے جانا ہے کس کس کے گھر مجھے
تم نے نہیں تو کس نے کیا در بہ در مجھے

میری نگاہ جلوہ طلب ہے تو کیا کروں
خود آپ نے دیا ہے شعورِ نظر مجھے

تیرے بغیر شہرِ تمنّا اُداس ہے
لگتا ہے اجنبی سا خود اپنا ہی گھر مجھے

شاید تری تلاش کا مقصد تمام ہو
اے زندگی! تُو دیکھ تو لے اِک نظر مجھے

حالانکہ چِھن گئی مری آنکھوں سے روشنی
دنیا سمجھ رہی ہے ابھی دیدہ ور مجھے

نیّر! یہ شخص لگتا ہے مجھ سے بھی معتبر
رسوائی لے کے آئی بھی تو کس کے گھر مجھے

موسمِ گُل میں ہوں اُجڑے ہوئے گلشن کی طرح
ایسی نظروں سے نہ دیکھو مجھے دشمن کی طرح

ہم ملے جب کبھی تہذیب کے دوراہے پر
جھک گئیں آپ کی نظریں کسی چلمن کی طرح

زندگی آج یہ کس موڑ پہ لے آئی ہے
آپ کی یاد بھی آتی ہے تو الجھن کی طرح

اب بھی مل جاتے ہیں کچھ چہرۂ ماضی کے نقوش
راستے میں کسی ٹوٹے ہوئے درپن کی طرح

گوشۂ دل میں اندھیرا ہے بظاہر لیکن
زخم روشن ہیں ابھی آپ کے کنگن کی طرح

نغمۂ درد کی مانند چمکتے ارماں
دل کے مندر میں مکیں ہیں کسی جوگن کی طرح

پھر بچھڑنے کا تو احساس نہیں ہے نیّر!
ہے نمی آنکھوں میں بھیگے ہوئے ساون کی طرح

وہیں سے راہ ملی ہم کو تیرگی کے لیے
چراغ جلتے ہیں جس گھر کی روشنی کے لیے

جب اپنے دن تھے تو خوشیوں کی کوئی قدر نہ کی
ہم آج روتے ہیں مانگی ہوئی خوشی کے لیے

دل و نگاہ میں زخموں کے پھول ہیں لیکن
کچھ اور چاہیئے شائستہ زندگی کے لیے

نگاہ ملتے ہی آنکھوں میں روشنی آئے
یہ ظرف چاہیئے احساس برتری کے لیے

عجیب بات ہے دورِ جدید کا انساں
نہ دوستی کے لیے ہے نہ دشمنی کے لیے

ہوس کے دور میں سرگرمیاں محبت کی
بڑا سہارا ہیں تہذیبِ عاشقی کے لیے

یہ جگمگاتے در و بام کیا کروں نیر
بہت ہے کوچۂ دلدار اجنبی کے لیے

کب آپ کے ہونٹوں سے ہنسی مانگ رہا ہوں
میں اپنے ہی پلکوں کی نمی مانگ رہا ہوں

مانوسِ الم ہوں مجھے مجبور نہ سمجھو!
میں کس سے یہاں کوئی خوشی مانگ رہا ہوں

بات اپنے ہی اشکوں کی ہے پی جاؤں گا وہ بھی
میں آپ سے کب تشنہ لبی مانگ رہا ہوں

پھر آرزو لے آئی مجھے تیری گلی میں
جو کچھ یہاں کھویا ہے وہی مانگ رہا ہوں

منزل پہ پہنچ جاؤں کہ رستے ہی میں ٹھہروں
کب آپ کی میں ہم سفری مانگ رہا ہوں

جو بھی مجھے ملنا ہے وہ مل جائے گا نیر!
کب آپ کے حصے کی خوشی مانگ رہا ہوں

منسوب تیرے نام سے ہر غم قبول ہے
تیرا دیا ہوا ہے مجھے ہر زخم پھول ہے

اے اہلِ کارواں مجھے تنہا نہ چھوڑ دو
ہر رہ گزر پہ میرے ابھی قدموں کی دھول ہے

جسموں پہ اپنے اب بھی ہیں زخموں کے پیرہن
پھولوں کا تذکرہ ہی یہاں پر فضول ہے

جو لوگ بھول بیٹھے ہیں مجھ غم نصیب کو
میں اُن کو یاد کرتا ہوں میرا اصول ہے

کیسے کٹے گی دوستو! اتنی طویل رات
دل آج پہلی شام سے بے حد ملول ہے

تاریک جن کے ذہن ہیں تیرہ رہا کریں
ویسے بھی روشنی سے اُلجھنا فضول ہے

میں سب کچھ جان کر ہی پی رہا ہوں
یہ کیسا زہر ہے میں جانتا ہوں

اندھیرے اِس قدر پھیلے ہوئے ہیں
میں اپنے آپ سے ٹکرا رہا ہوں

لبِ دریا کھڑا ہوں پھر بھی اے دوست
ہمیشہ کی طرح پیاسا رہا ہوں

نہ دے آواز تُو لہجہ بدل کر
تری آواز میں پہچانتا ہوں

زلیخائی ندامت کس لیے ہے
میں ساری تہمتیں اپنا رہا ہوں

کئی لمحوں کے زینوں سے اُتر کر
تری محفل میں تنہا آ گیا ہوں

گلِ تر سے بھی وہ نازک ہیں نیّر
انھیں چھوتے ہوئے بھی ڈر رہا ہوں

کس کی آواز پہ ہم آپ ٹھہر جاتے ہیں
ایک آواز ہی سنتے ہیں جدھر جاتے ہیں

ایک اک لمحہ مرے دل سے لپٹ جاتا ہے
تیری یادوں کے جب اوراق بکھر جاتے ہیں

خون پھر خون ہے دامن کی حفاظت کیجے
ورنہ الزام سبھی آپ کے سر جاتے ہیں

جن مقامات پہ جل جاتے ہیں جبریل کے پر
ایسی راہوں سے بھی دیوانے گزر جاتے ہیں

تیرے ہاتھوں کی لکیر دل میں ہے قسمت میری
نقش مٹ جائیں تو سب خواب بکھر جاتے ہیں

جب بھی محرومیاں پی جاتی ہیں آنسو نیّر!
دل کے سب زخم سلیقے سے ابھر جاتے ہیں

وقت کے اس حادثے پر ذہن ہے الجھا ہوا
شیشۂ دل ہے کسی پتھر سے ٹکرایا ہوا

دوستو کچھ دیر تو پلکوں پہ رہنے دو نمی
چھوڑ آیا ہوں میں اپنا آشیاں جلتا ہوا

ظلم کی تاریخ دہرانے لگا ہے آج بھی
کون ہے یہ آہنی زنجیر سے لپٹا ہوا

روشنی آنکھوں کی دھوکہ ہی سہی پردہ نہ تھی
آپ کی کم آگہی سے مجھ کو بھی دھوکا ہوا

کب تلک آخر نہ ابھریں گے ترے نقشِ قدم
اک مسافر کب تلک پھرتا رہے بھٹکا ہوا

گردشِ حالات کا تم ہی نہیں تنہا شکار
ایک نشتر میرے پہلو میں بھی ہے اترا ہوا

دل شکن تھا کتنا کم آمیز نظروں کا سلوک
میں بھری محفل میں تیرؔ اور بھی تنہا ہوا

پیار کی رسم کو سوچا ہے کہ گھر گھر کر دوں
کوئی چھوٹا نہ بڑا سب کو برابر کر دوں

کتنے نازک سے خیالات کا درپن ہے یہ
دل بہت نرم ہے کیسے اسے پتھر کر دوں

سیج کانٹوں کی تو انعام ہے بیداری کا
آپ کہتے ہیں کہ میں پھولوں کا بستر کر دوں

میری سچائی پہ تم اتنا بھروسہ نہ کرو
نذرِ آتش نہ کہیں جھوٹ کا دفتر کر دوں

سنگ ریزوں کی ابھی پیاس بجھانی ہے مجھے
اور کچھ تیز نہ کیوں تیشۂ آذر کر دوں

خضر کی سست روی ساتھ نہ دے گی نیرؔ
اپنی لغزش ہی کو سوچا ہے کہ رہبر کر دوں

محفلِ رنداں میں شاید دیر سے تم آ گئے
خالی شیشوں کی طرح احباب پھر ٹکرا گئے

ایک ہی کشکول ہے چھوٹا بڑا کوئی نہیں
ہم سے درویشوں میں رہ کر تم بھی دھوکا کھا گئے

ہم تو کم آمیز تھے احباب لائے کھینچ کر
اعتماد اب آ گیا تو سب کے سب گھبرا گئے

زندگی بھر جو ہمیں خود راہ دکھلاتا رہا
کیا بتائیں ہم اُسی پتھر سے ٹھوکر کھا گئے

غور سے ہم نے سُنی تو اپنی ہی آواز تھی
آپ کے لہجے کو سُن کر ہم بھی دھوکا کھا گئے

تھی پسِ پردہ بھی کچھ میری ہی اپنی داستاں
حادثہ میرا تھا لیکن آپ کیوں گھبرا گئے

کس کو راس آیا ہے نیّرؔ مسکرانے کا خیال
رفتہ رفتہ آنسوؤں کی زد میں ہم بھی آ گئے

خلوصِ عشق کا اظہار سرسری تو نہیں
مرے رفیق کو احساسِ کمتری تو نہیں

محبت ایک لطیف آرزو کا نام سہی
تمہاری یاد سے لیکن برابری تو نہیں

خزاں کے پاؤں سے آتی ہے گھنگروؤں کی صدا
چمن کی گود ابھی اتنی ہری بھری تو نہیں

کس احتیاط سے نقشِ قدم چراتے ہو
یہ رہزنی ہے مرے دوست رہبری تو نہیں

غریبِ شہر کی نیندوں کو قید کر لینا
تمہارے شہر کا اندازِ دلبری تو نہیں

ہر ایک زخمِ جگر بن گیا "گلِ تازہ"
یہ سوچتا ہوں ابھی شاخِ دل ہری تو نہیں

جگر کے داغ اُبھر آئے آرزو کی طرح
خیالِ دوست بھی نیّر! مصوّری تو نہیں

حیاتِ تازہ پہ جاری رہے ستم کوشی
چڑھاؤ زخموں کی چادر بہ نامِ گُل پوشی

مرے بہکنے کو اعتراز مے کشی نہ کہو
جگر کا خون پیا ہے بہ طرزِ مے نوشی

زباں اگرچہ ترستی ہے گفتگو کے لیے
بہ حکمِ دوست لبوں پر ہے مُہرِ خاموشی

نظر جھکا کے بھی ہوتی ہے گفتگو اکثر
مرے لیے نہ کرو اہتمامِ روپوشی

ابھی اٹھاؤ نہ تم اپنی انجمن سے مجھے
بہ قدرِ حوصلہ طاری ہے مجھ پہ بے ہوشی

لبوں کو مصلحتاً ہم نے سی لیا لیکن
وہ دن قریب ہے جب بول اٹھے گی خاموشی

نہ جانے کس لیے جاری ہے آج بھی نیّر!
اُداس رات کی تنہائیوں میں سرگوشی

مے خانہ کی تہذیب پہ یہ سخت گھڑی ہے
رندوں میں یہ کیوں آخرِ شب پھوٹ پڑی ہے

خوشبوئے بہاراں درِ زنداں پہ کھڑی ہے
میں ہوں کہ مرے پاؤں میں زنجیر پڑی ہے

دل میں تو بہت کچھ ہے مگر کہہ نہیں سکتا
خاموشیِ محبت کی سزا کتنی کڑی ہے

ٹوٹے ہوئے دل کو نظر انداز نہ کیجے
کہنے کو یہ چھوٹی ہے مگر بات بڑی ہے

انجامِ وفا آ تجھے آنکھوں میں چھپا لوں
رسوائی نکل کر سرِ بازار کھڑی ہے

بے لوث محبت کے تقاضوں کو تو سمجھو
تکمیلِ تمنا کے لیے عمر پڑی ہے

کچھ دیر سہی بزم میں آ جائیے تیشرؔ
پھر میری وفا آج سرِ دار کھڑی ہے

اپنی روش سے دوستو! ایک بٹ رہا ہوں میں
حلقوں میں دشمنوں کے کہاں بٹ رہا ہوں میں

زہرابِ زیست مجھ کو پلانے سے فائدہ
پھولوں کی پتیوں ہی سے جب کٹ رہا ہوں میں

میں بجلیوں کی زد سے گریزاں نہیں رہا
مانا کہ بادلوں کی طرح چھٹ رہا ہوں میں

تُو منصبِ سجود سے مجھ کو جُدا نہ کر
اے دوست! تیرے قدموں کی آہٹ رہا ہوں میں

اپنی بلندیوں سے گراتے ہو کس لیے
پربت پگھل رہے ہیں تو خود گھٹ رہا ہوں میں

نیّر! اندھیرے راہ میں روکیں تو کیا ہوا
لمعاتِ زرفشاں کی طرح بٹ رہا ہوں میں

نا گفتنی تھے ہم، تو خیالات میں رہے
تجھ سے نظر ملی تو تری ذات میں رہے

لفظوں کے انتخاب میں سہوِ نظر سہی
کردار کا بھرم تو ہر اک بات میں رہے

یارب! دیارِ غیر میں آوارہ گر پھروں
مٹّی مرے وطن کی مرے ہاتھ میں رہے

جب خود فریبی جرم تھی تہذیب کے لیے
کیوں خود شناس لوگ حجابات میں رہے

موسم کی تازہ خوشبو میں کل بھیگتے ہوے
کچھ دیر ہم بھی پھولوں کی برسات میں رہے

رشتوں کے اِس ہجوم میں تیر! یہ سوچ لو
کیوں امتیاز اپنی ملاقات میں رہے

دشمن سے کسی دن سرِ مقتل بھی لڑے ہو
تم لوگ تو مدّت سے فصیلوں پہ کھڑے ہو

غیروں سے اُلجھنے میں ندامت نہیں ہوتی
چہرہ یہ بتاتا ہے کہ اپنوں سے لڑے ہو

لوٹا ہوا سرمایہ کسی کا نہیں ہوتا
ہم جیسے خطاکاروں کے کیوں پیچھے پڑے ہو

جب قتل کا الزام کسی اور کے سر ہے
پھر کس لیے اِس لاش سے تم دور کھڑے ہو

بے حرمتیِ احباب کی دیکھی نہیں جاتی
خاموش ہیں یہ سوچ کے تم ہم سے بڑے ہو

جب باعثِ رسوائی ہے آوارہ مزاجی
گھر چھوڑ کے کیوں شہر کی سڑکوں پہ پڑے ہو

جب درد کی تقسیم ہی ممکن نہیں نیّر
احسان کا کیوں بوجھ لیے سر پہ کھڑے ہو

کس کو قاتل میں کہوں کس کو مسیحا سمجھوں
سب یہاں دوست ہی بیٹھے ہیں کسے کیا سمجھوں

اک خلش تھی سو ترے نام سے منسوب ہوئی
اب کسے ٹوٹے ہوئے دل کا سہارا سمجھوں

زندگی لپٹی ہوئی ہے تری یادوں کی طرح
آج کس طرح سے میں اپنے کو تنہا سمجھوں

وہ اک احساس جو زخموں کا مقدر تھا کبھی
اس کو میں درد کہوں، زخمِ تمنا سمجھوں

دل جو ٹوٹا تو کئی ہاتھ دعا کو اُٹھے
ایسے ماحول میں اب کس کو پرایا سمجھوں

زندگانی کی یہ دریوزہ گری کس کے لیے
موت کو کس کی محبت کا جنازہ سمجھوں

یوں تو گلشن میں کئی پھول کھلے ہیں نیّر
میں ہر اک پھول کو کیسے گُلِ تازہ سمجھوں

اتنے لگے ہیں زخم کہ دل بولتا نہیں
آئینہ اپنا بھید کبھی کھولتا نہیں

زخموں کو میرے پھول سمجھتے ہیں سب مگر
پلکوں پہ اپنے کوئی انھیں رولتا نہیں

غم بھی بہ قدر حوصلہ ملتا ہے دوستو
بازار میں یہ جنس کوئی رولتا نہیں

ہر زخم تیرے نام سے سہتا تو ہوں مگر
بات اپنے دل کی مصلحتاً بولتا نہیں

مانوس ہوں کچھ اتنا غم زندگی سے میں
دل فرطِ انبساط سے بھی ڈولتا نہیں

نیّر! خود اشک زینتِ مژگاں بنے مگر
موتی سمجھ کے کوئی انھیں رولتا نہیں

کس کا دل ٹوٹا ہے اس کا تجھ کو اندازہ نہیں
کیا ترے ہاتھوں سے کوئی آئینہ چھوٹا نہیں

میں تمہارے ساتھ ہی تھا دور سے گزرا نہیں
اپنے دیوانے کو لیکن تم نے پہچانا نہیں

زندگی بھر جس نے چھوڑا ہے تڑپنے کے لیے
ایسے محسن کو کبھی میں بے وفا کہتا نہیں

بے خبر انجام سے ہو کر تم آئے ہو مگر
کل زمانہ کیا کہے گا تم نے یہ سوچا نہیں

آئے ہو تو روبرو بیٹھو گھڑی بھر کے لیے
آج تک میں نے نظر بھر کر تمہیں دیکھا نہیں

کتنی شمعیں رات بھر جلتی رہیں بجھتی رہیں
تیرا دامن میری پلکوں تک مگر پہنچا نہیں

موسمِ گُل میں بھی نیّرؔ! میں تہی دامن رہا
سب ہیں گلشن میں مگر میرا "گُلِ تازہ" نہیں

تھکن سفر کی ہے اب تک بھی خوابگاہوں میں
بھٹک نہ جائیں کہیں قافلے اجالوں میں

اندھیرے راہ نہ روکیں گے تم چلے آنا
ہے روشنی ابھی بجھتی ہوئی نگاہوں میں

سہاگ رات کی شمعوں کا سارا سوز و گداز
سمٹ کے رہ گیا ان ڈوبتی نگاہوں میں

مجھی کو تنگیٔ داماں پہ ہے پشیمانی
بہت سے پھول کھلے ہیں تری نگاہوں میں

نسیم صبح دکن پھر رہی ہے آوارہ
یہ کون کھو گیا کشمیر کی بہاروں میں

سحر فریب اندھیروں سے مجھ کو کیا تمیز
بہت سی شمعیں ہیں روشن مرے خیالوں میں

۳۲۳

تم بھی یہ کہہ رہے ہو کہ ہم خود پسند ہیں
حالانکہ ہم تمہاری نگاہوں میں بند ہیں

اپنے ہی جیسا شہر میں اک اور شخص تھا
کیا جانے کس کے سوگ میں بازار بند ہیں

جتنے بھی غم ملے ہیں وہ آپس میں بانٹ لیں
تم بھی دکھی ہو ہم بھی دلِ دردمند ہیں

ٹوٹا کبھی نہ آپ کی یادوں کا سلسلہ
یہ کچھ بھی ہو ہم آپ کے احسان مند ہیں

یہ مصلحت پسند ہمیں بھی ملے مگر
اپنی روش پہ آج بھی ہم کاربند ہیں

مایوس جب خرد ہوئی دل ساتھ ہو گیا
یہ میرے دونوں دوست مرے بازوبند ہیں

تیر! بچھڑ کے اُن سے کہیں کے نہیں رہے
یہ کچھ دن سے میکدے کے بھی دروازے بند ہیں

اک ہم خیال شخص سے جب یوں ہی چل گئی
باقی حیات جاگتے لمحوں میں ڈھل گئی

مفہوم میرے خط کا سیاہی نگل گئی
جب لفظ زنگ ہوگئے تحریر جل گئی

ترکِ وطن کیا تھا بڑی احتیاط سے
لوٹا تو اپنے شہر کی حالت بدل گئی

رندوں کی میں پناہ میں تھا بچ گیا مگر
ایسی ہوا تھی گرم کہ نس نس پگھل گئی

شادابیوں کے زخم بھی کتنے عزیز ہیں
جس شاخ پہ نگاہ تھی وہ شاخ جل گئی

وہ خوش نگاہ جیسے ہی محفل میں آگیا
بکھری ہوئی تھی محفلِ یاراں، سنبھل گئی

نیّر میں روشنی ہی سے محروم ہوگیا
جب شمع رفتہ رفتہ سیاہی میں ڈھل گئی

احساس کے آنگن میں وہی پھول بدن ہے
نیّرؔ کئی برسوں سے جو موضوعِ سخن ہے

الجھے ہوئے حالات کے سینے میں گھٹن ہے
یہ زیست بھی اک سلسلۂ دار و رسن ہے

پھولوں کا لہو جس نے پیا صحنِ چمن میں
سنتے ہیں وہی شخص، نگہبانِ چمن ہے

خوش پیرہنی جس کو عطا کی تھی صبا نے
لاش اُس کی ترے شہر میں بے گور و کفن ہے

خوشبوئے وفا ساتھ ہے گلشن ہو کہ مقتل
اِس شہر کی مٹی میں ترا سانولا پن ہے

یہ ترکِ تعلق ہے کہ اظہارِ محبت
ہونٹوں پہ ہنسی آپ کے ماتھے پہ شکن ہے

بک جاؤں گا جذبات کا سودا نہ کروں گا
نیّرؔ! گلِ تازہ کی امانت مرا فن ہے

ہم نے کب تم سے کہا پھولوں کا بستر چاہیئے
سر چھپانے کے لیے چھوٹا سا اک گھر چاہیئے

خودکشی کی رسم کو محدود کرنے کے لیے
زندگی کے پیار کی تشہیر گھر گھر چاہیئے

جب بلا تخصیص موسم بھیگتا رہتا ہوں میں
پھر بھی مجھ کو کیوں وہی اک دیدۂ تر چاہیئے

بے زباں آنسو ہی کافی تھے کہانی کے لیے
داستانِ غم سناؤں گا تو دفتر چاہیئے

دوستو! کھوئی ہوئی منزل کو پانے کے لیے
کم سے کم اُن کی گلی کی ایک ٹھوکر چاہیئے

سانس لینے کا یہاں پیدائشی حق ہے ہمیں
روشنی یا تیرگی سب کے برابر چاہیئے

روشنی کی کیا کمی ہے شہرِ خوباں میں مگر
ایسی محفل کے لیے تو صرف نیّر چاہیئے

پُرسشِ احوال پر بھی شکوۂ بیداد ہے
دوست ہے اپنا، مگر کتنا ستم ایجاد ہے

سِل گئے ہیں لب تو کیا آنکھوں میں میری دیکھئے
اِن نگاہوں میں بھی اِک چھوٹا سا گھر آباد ہے

مجھ سے مل کر کیا کرو گے دور ہی سے دیکھ لو
میری ساری زندگی فریاد ہی فریاد ہے

کرب میں بھی خوش مزاجی ہم سے وابستہ رہی
مسکرا لیتے ہیں جیسے واقعی دل شاد ہے

کیسے کیسے پھول دیکھے ہم نے گلشن میں مگر
اُس "گلِ تازہ" کی خوشبو کے سوا کیا یاد ہے

زندگی اک نامکمل حادثے سے کم نہیں
شہرِ دل آباد کہلا کر بھی کب آباد ہے

کتنا غم انگیز اُن کا رخصتی انداز تھا
آج بھی نیّر مجھے ایک ایک لمحہ یاد ہے

کتنی حسرت سے یہاں سانس لیا کرتے ہیں
زندگانی سے جو مایوس ہوا کرتے ہیں

فطرتِ عشق ہے یہ تم پر کوئی احسان نہیں
یاد کرنا ہے تمہیں یاد کیا کرتے ہیں

خوش لباسی کا کفن پہنے ہوئے محفل میں
ایسے کچھ لوگ ہمیں روز ملا کرتے ہیں

جسم جل جاتے ہیں خاموش دھواں اٹھتا ہے
اس سلیقے سے بھی کچھ لوگ جیا کرتے ہیں

میکشی شرط نہیں فن کے نکھرنے کے لیے
وہ بھی خالق ہیں جو اشکوں کو پیا کرتے ہیں

جب بھی کھل جاتا ہے ان تشنہ نگاہوں کا بھرم
اپنے دامن کو بھی ہم دیکھ لیا کرتے ہیں

پھر بھی ذہنوں میں اجالا نہیں ہوتا نیّرؔ
بزمِ احباب میں ہم روز جلا کرتے ہیں

زندگانی مری کچھ اور سنبھل جاتی ہے
جب بھی بے ربطیٔ حالات سے ٹکراتی ہے

جب بھی آتا ہے اُن اُلجھی ہوئی زلفوں کا خیال
خود بہ خود پاؤں کی زنجیر پگھل جاتی ہے

کیوں مرے بدلے ہوئے لہجے کا شکوہ ہے تمھیں
چوٹ لگتی ہے تو آواز بدل جاتی ہے

دل کے سادہ سے ورق پر جو لکھی تھی تم نے
بعض اوقات وہ تحریر بھی جل جاتی ہے

جب بھی احباب ستم ڈھاتے ہیں دشمن کی طرح
میری آواز بہت دُور نکل جاتی ہے

بات خاموش نگاہوں کی ہمیشہ نیّر
اُن کی محفل میں بہ عنوانِ غزل جاتی ہے

اُجالے لایا ہوں اِک ایسے دیدہ ور کے لیے
جو بے نیاز تھا کل تک کسی نظر کے لیے

کسے خبر تھی کہ کٹ جائیں گے ہمارے ہاتھ
دُعائیں مانگی تھیں کیا ایسی ہی سحر کے لیے

مجھے بچھڑنے کا احساس کیوں دلاتے ہو
نظر کی چوٹ ہی کافی ہے عمر بھر کے لیے

چراغِ زخمِ تمنا نہ شمعِ سوزِ فراق
کوئی چراغ تو روشن ہو اپنے گھر کے لیے

پتہ کہیں نہ چلا مجرمِ بہاراں کا
دعائیں راس نہیں آئیں چشمِ تر کے لیے

قدم قدم پہ اندھیروں کا جال پھیلا ہے
یہ اہتمام ہے اک جنبشِ نظر کے لیے

کہاں تلک یوں ہی بکھرے گی روشنی نیترؔ!
بچا کے رکھنا ذرا اپنی بھی نظر کے لیے

حیات جس کی ہے اِس دورِ تشنگی کا مزار
اُسی کا کرتی ہے ماتم چمن میں فصلِ بہار

وہ داغِ دل جو کبھی خلوتوں کی زینت تھے
زباں کھلتے ہی رسوا ہوئے سرِ بازار

تمام عمر تشدد سے جو گریزاں تھے
اُنھیں کا تم نے کیا اپنے قاتلوں میں شمار

چمن میں اب بھی تبسم فروش ہیں شاید
اُداس اُداس سی لگتی ہے اب کے فصلِ بہار

ہو دیدہ ور تو خود اپنی نظر کو پہچانو
یہ بھول جاؤ نظاروں کی تیز ہے رفتار

زباں کھلی تو صلیبوں سے روشناس ہوئے
ہوے نہ بند کسی وقت بھی لبِ اظہار

قریبِ میکدہ احساسِ تشنگی نیّرؔ
کسی نگاہ کی جنبش سے کم نہیں آزار

نہ مرثیہ ہے، غزل ہے نہ یہ قصیدہ ہے
ہر ایک شخص یہاں پھر بھی آب دیدہ ہے

یہ کیسا شہر ہے مقتل کی سی اداسی ہے
یہاں یہ دوستو! ہر شخص سر بریدہ ہے

سنا ہے جسموں کے سوداگروں میں ہے شامل
وہ شخص دیکھنے میں کتنا برگزیدہ ہے

یہ آستانہ ہے کس کا ہمیں نہیں معلوم
کئی دنوں سے یہاں اپنا سر خمیدہ ہے

تمہاری آنکھوں میں کچھ دن سے پڑھ رہا ہوں میں
وہ ایک بات جو مدت سے ناشنیدہ ہے

یہ اجنبی ہے، مگر اعتبار کر لے گا
دلِ غریب تو ویسے بھی خوش عقیدہ ہے

یہ کیسا موسمِ گل اب کے آگیا نیّر!
ہر ایک پھول یہاں پیرہن دریدہ ہے

ہم نذر کریں کس کو پھولوں کی یہ مالائیں
اشکوں کے اجالوں سے لکھی ہیں کویتائیں

اسبابِ بغاوت تو معلوم ہیں ہم کو بھی
زنجیرِ وفاداری کس شخص کو پہنائیں

اے دوست بھروسہ کیا ان گرم ہواؤں کا
شائستہ نظر رہنا جب گھر سے نکل جائیں

کیا بحث کریں تم سے سمجھوتہ ہی بہتر ہے
بات اپنے ہی گھر کی ہے بازار میں کیوں لائیں

پھر غور سے پڑھ لیں گے ہاتھوں کی لکیروں کو
مٹ جائیں گی جس دن بھی قسمت کی یہ ریکھائیں

اس شہر کی مٹی میں پھولوں کی سی خوشبو ہے
پابندِ جفا کب تھیں اس شہر کی سلمائیں

مے خانہ کا دروازہ پھر بند ہوا ہم پر
اب تم ہی کہو نیّر کس شخص کے گھر جائیں

دلوں کے زخم بھی اِتنے بے حجاب نہ تھے
زباں ملی بھی تو مقصد میں کامیاب نہ تھے

لہو کا قرض چکاتے گناہ گار سبھی
قتیلِ آرزو اِتنے بھی بے حساب نہ تھے

شفق سے اور بھی کچھ اُن کا رنگ ہلکا تھا
گلاب چہرے تھے زخموں کے وہ گلاب نہ تھے

بڑھی جو پیاس تو اشکوں سے بھر لیا ساغر
غریب لوگ تھے ہم صاحبِ نصاب نہ تھے

غریب خانے میں کیا کیا چراغ روشن ہیں
ہمارے گھر میں کبھی اِتنے ماہتاب نہ تھے

ہر اک نگاہ میں ہم اجنبی رہے نیّرؔ!
حضورِ دوست میں جب تک کہ باریاب نہ تھے

کب سے خاموش ہیں ہم خالی مکانوں کی طرح
کب تلک پھرتے رہیں خانہ بدوشوں کی طرح

ذہن کی روشنی، دل میں تو اُتر جانے دو
یہ اندھیرے نظر آئیں گے اُجالوں کی طرح

کاسۂ زیست لیے ہاتھوں میں اب بھی کچھ لوگ
ہم کو مل جاتے ہیں اِس شہر میں لاشوں کی طرح

یاد کر کرکے بھلا دیتے ہیں اکثر احباب
ہم کو پڑھتے ہیں سبھی درسی کتابوں کی طرح

تم نے جاتے ہوئے یہ کیسی امانت سونپی
ایک اِک لمحہ گراں ہے کئی برسوں کی طرح

اِس بھری بزم میں پھولوں کا کفن پہنے ہوئے
اب بھی کچھ لوگ ہیں بے نام سے رشتوں کی طرح

تم ہی اچھا سا کوئی نام دو ان کو نیرؔ!
حادثے ملتے ہیں ہم سے بھی عزیزوں کی طرح

نظر فریب سہی پھر بھی آب دیدہ ہے
ترا خیال تو مجھ سے بھی برگزیدہ ہے

نہ گفتگو نہ خموشی نہ کچھ پیام و سلام
بہت دنوں سے نظر آپ کی کشیدہ ہے

ہمارا وہم تو قاتل کو چارہ گر سمجھے
زہے نصیب یہ دل کتنا خوش عقیدہ ہے

لباس دوست میں لپٹا ہوا ہے دیوانہ
بہ یک نگاہ تو وہ پیرہن دریدہ ہے

خدا کے واسطے جھوٹی تسلیاں تو نہ دو
دلِ غریب تو ویسے بھی غم رسیدہ ہے

یہ کچھ اور دن رہنے کا نٹوں سے گفتگو تیز
صبا سے کہیے ابھی غنچہ تو دمیدہ ہے

جانے کس جرمِ تمنّا کی سزا مانگے ہے
زندگی، دیدۂ پُرنم کا صلہ مانگے ہے

مجھ پہ احسان یہی اب میں کہاں سے لاؤں
وہ "گُلِ تازہ" جسے بادِ صبا مانگے ہے

آپ لوٹیں گے تو پلکوں پہ سپیدی ہو گی
پھر بھی دل آپ سے ملنے کی دعا مانگے ہے

پہلی برسات کی مٹّی کی ہو خوشبو جس میں
آرزو اب بھی وہی دستِ حنا مانگے ہے

لگا ہے گاہے ہمیں محسوس یہی ہوتا ہے
اُن کا آنچل کبھی پھولوں کی ہوا مانگے ہے

زندگی شورِ سلاسل میں گرفتار رہی
دل مگر آج بھی پائل کی صدا مانگے ہے

فرشِ گُل ہو کہ وہ کانٹوں کی زمیں ہو نیّرؔ!
اپنی آشفتہ سری رسمِ وفا مانگے ہے

کام آئے تو یہ چشم گنہ گار بھی لے جا
نفرت کی فضاؤں میں مرا پیار بھی لے جا

میں یہ نہیں کہتا کہ گنہ گار نہیں ہوں
سر شرم سے جھک جائے تو دستار بھی لے جا

یہ لوگ کہیں تجھ کو تہی دست نہ سمجھیں
احباب سے ملنا ہو تو تلوار بھی لے جا

تنہائی سے گھبرایا ہوا سہما ہوا ہے
دیوانہ محمل کو سرِ دار بھی لے جا

شائستۂ آداب ہے احباب کی محفل
جانا ہو اگر عظمتِ کردار بھی لے جا

جز مرگِ تمنا وہاں اب کون ہے نیرؔ!
ہمراہ تو اب حسرتِ دیدار بھی لے جا

لوگوں ہی کے آنگن میں یہاں چھاؤں گھنی ہے
ہم شہر میں ہیں پھر بھی غریب الوطنی ہے

ٹوٹے ہوئے آئینوں کی قیمت نہ گراؤ
پتھر جو تراشے ہیں تو تصویر بنی ہے

جو سر کو اٹھائے ہوئے پھرتا ہے یہاں پر
وہ شخص ہی کیوں قابلِ گردن زدنی ہے

ہے جرم یہاں مصلحت آمیز تبسم
رسوائی کا باعث بھی تری کم سخنی ہے

اب تک تہی دامن کوئی اس گھر سے نہ لوٹا
وہ شخص پریشاں ہے مگر دل کا غنی ہے

پیراہنِ بیتاب سے ہم کھا گئے دھوکہ
لہجہ یہ بتاتا ہے کہ تو بھی دکنی ہے

کب تک میں بھٹکتا رہوں اس شہر میں تیرؔ
کیوں دل میں مرے کیفیتِ بے وطنی ہے

تم بھی یہیں تھے، اپنے مکانوں میں کیا نہ تھا
لُٹنے سے پہلے قافلے والوں میں کیا نہ تھا

خنجر کی دھار پر تھی قبیلے کی آبرو
اس کے سوا بھی خانہ بدوشوں میں کیا نہ تھا

کچھ مصلحت تھی ایسی کہ خاموش ہم رہے
سچ پوچھئے تو آپ کی آنکھوں میں کیا نہ تھا

ذہنی تحفظات تھے تم خود نہ پڑھ سکے
دیوانِ میر جیسی کتابوں میں کیا نہ تھا

جس موڑ پہ بھی جائیے مے خانے بند ہیں
پہلے ہمارے شہر کی راتوں میں کیا نہ تھا

تم خود ہی ابتدا سے تو ہم پسند تھے
ورنہ قلندروں کی دُعاؤں میں کیا نہ تھا

محلوں کی روشنی سے نکل کر تو دیکھئے
نیّر! ہمارے گھر کے اُجالوں میں کیا نہ تھا

شاید پرانے زخم کا یہ انتقام ہے
قاتل کے لب پہ اب بھی مسیحا کا نام ہے

کروٹ بدلنے ایک ہی شب درمیاں بھی
ماتم ہے اب کہیں تو کہیں جشنِ عام ہے

پھولوں کے جسم سے بھی اُترنے لگے لباس
شاید یہ جشنِ گُل کا نیا اہتمام ہے

اُن کے گلاس میں بھی ہے تہذیب کا لہو
کل تک جو کہہ رہے تھے کہ پینا حرام ہے

پربت کئی شبوں کے ہیں سر پر کھڑے ہوئے
سورج ابھی ڈھلا ہے ابھی پہلی شام ہے

جتنے شریف لوگ تھے محفل میں آ گئے
اب کس کو امتیازِ حلال و حرام ہے

نیرؔ! ہم ایسی بزم سے سمجھوتہ کیا کریں
اپنے اصول کا بھی یہاں قتلِ عام ہے

اجنبی شہر ہے ہم پر بھی بھروسہ نہ کرو
دِل کے رشتوں کا ابھی سے یہاں سودا نہ کرو

صرف آنکھوں ہی میں رہنے دو محبت کا بھرم
گھر کی باتیں کبھی بازار میں لایا نہ کرو

اِس لیے چپ ہیں کہ تم کو ہی ندامت ہوگی
زندگی کیسے بسر ہوتی ہے پوچھا نہ کرو

اب زیادہ نہیں دو چار قدم چلنا ہے
مجھ کو مُڑ مُڑ کے تم اِس طرح سے دیکھا نہ کرو

میں نے برسوں اِن اُجالوں سے محبت کی ہے
اور کچھ دن مری آنکھوں میں اندھیرا نہ کرو

دور و نزدیک اندھیروں کے سوا کچھ بھی نہیں
ایسے حالات میں محفل سے اُٹھایا نہ کرو

دشمنوں کے بھی تو احسان ہیں تم پر نیّر!
صرف احباب کو ہی ٹوٹ کے چاہا نہ کرو

اور ہی لوگ ہیں وہ راہ سے ہٹنے والے
ہم نہیں آپ کی تلوار سے کٹنے والے

دشمنوں سے بھی بڑھائے ہیں مراسم ہم نے
ہم نہیں اپنے ہی احباب میں بٹنے والے

بے سہارا تو نہ سمجھے ہمیں اوروں کی طرح
ہم بھی ہیں آپ کے دامن سے لپٹنے والے

اک نظر خاص اداؤں سے ہمیں دیکھو تو لو
ہم تو ہیں پھول کی پتی سے بھی کٹنے والے

زندگی تیرا کبھی ساتھ نہیں دے سکتے
چلتے چلتے تری راہوں سے پلٹنے والے

بڑی مشکل سے ہی کم ہوتی ہے نفرت کی فضا
یہ وہ بادل نہیں آسانی سے چھٹنے والے

ہم تو خوشبو کی طرح پھیل رہے ہیں نیر!
ہم نہیں وقت کے پہلو میں سمٹنے والے

روشنی جب کبھی اندھیاروں میں بٹ جاتی ہے
جتنی تاریکی ہے ماحول کی چھٹ جاتی ہے

ساتھ دے وقت تو اے دوست رگِ گل سے کبھی
ظلم کی آہنی زنجیر بھی کٹ جاتی ہے

جب بھی تنہائی کا احساس گراں ہوتا ہے
دل کی دھڑکن مرے پہلو سے لپٹ جاتی ہے

صاف باطن ہے تو پھر کیوں ہے صداقت سے گریز
جھوٹ کی عمر تو لمحات میں گھٹ جاتی ہے

جاگتی آنکھیں ندامت سے جھکی جاتی ہیں
شبنمی پلکوں سے جب نیند اچٹ جاتی ہے

خاک کو نور کا اعزاز دلانے کے لیے
میری مٹی ترے دامن سے لپٹ جاتی ہے

عام ہو جاتی ہے جب تشنہ نگاہی تیرا
زندگی اور بھی کچھ میری سمٹ جاتی ہے

اجل کے سایے میں بھی پاسِ وضع داری ہے
پڑی ہے پاؤں میں زنجیر رقص جاری ہے

سلوکِ دوست سے ہم نے بھی زخم کھائے ہیں
نگارِ شہر کی ہم کو بھی پاسداری ہے

شبِ فراق میں تسکینِ آرزو کا خیال
مرے خیال میں توہینِ بے قراری ہے

جو کل تلک تھے مسیحا وہ بن گئے قاتل
یہ کیسی شہرِ تمنا میں رسم جاری ہے

اجل بھی سر پہ گریباں ہے زندگی کے لیے
یہ دیکھنا ہے کہ یہ رات کس پہ بھاری ہے

شگفتہ لمحوں سے جو لوگ بدگمان رہے
سنا ہے اُن کو بھی احساسِ غم گساری ہے

کسی سے آج میں نظریں ملا نہیں سکتا
سلوکِ دوست سے تیرہ دہ شرمساری ہے

اپنی تاریخ کو دہراتی ہیں اکثر آنکھیں
بن گئیں آئینہ خانوں میں بھی پتھر آنکھیں

پاس اپنے رہیں یا شہر سے وہ دُور رہیں
اپنا احساس دلاتی ہیں برابر آنکھیں

ہر کسی گھر میں اندھیرا نہیں ہونے دیں گے
ہم کو مل جائیں اگر تیری منور آنکھیں

ایک دو پل نہیں صدیوں سے اسی حال میں ہیں
کون سا درد لیے پھرتی ہیں گھر گھر آنکھیں

آج کی شب بھی اسی طرح سے کٹ جائے گی
آپ کیوں لائے ہیں آنکھوں میں چھپا کر آنکھیں

روشنی گھر میں ہے جن کے انھیں آنکھیں نہ ملیں
کس غریبی کا دکھاتی ہیں یہ منظر آنکھیں

تشنگی پی گئیں کتنی ہی شبوں کی نیّر!
ریت کے شہر میں ٹھہرا ہوا ساگر آنکھیں

جوہر شناس نظریں ابھی پتھروں میں ہیں
کیا جانے کتنے لعل و گہر کنکروں میں ہیں

کیا بے بسی ہے سایۂ دیوار بھی نہیں
ہم لوگ ایک عمر سے ایسے گھروں میں ہیں

دستِ دراز، عہد کی تاریخ بن نہ جائیں
کتنے ہی حادثے ابھی ان خنجروں میں ہیں

سہوِ نظر سے جو نظر انداز ہو گئے
اے دشمنِ وفا! وہ ترے ہمسروں میں ہیں

یہ بے نیازِ عیش، قلندر مزاج لوگ
دل کے بہت غنی ہیں مگر بے زروں میں ہیں

اپنی نظر کی چوٹ بھی پہچانتے نہیں
کچھ ایسے کم نگاہ بھی دانشوروں میں ہیں

نیّر! یہ کن کے اتنے شگفتہ مزار ہیں
کچھ تازہ تازہ پھول ابھی چادروں میں ہیں

پیار کی شائستگی پر جب کبھی آنچ آئے گی
دل کی رگ رگ سوکھے پتوں کی طرح جل جائے گی

اعتمادِ رہ نوردی حد سے بڑھ جائے اگر
زندگی خود اپنے ہی آنگن میں ٹھوکر کھائے گی

خود شناسوں کی نظر ہے تجھ پہ میلوں میں نہ جا
اے متاعِ زیست! تو اُس بھیڑ میں کھو جائے گی

بھیگی آنکھوں میں اگر کاجل یونہی پھیلا رہے
آنسوؤں کی ایک دن پہچان بھی مٹ جائے گی

لاکھ چاہا اس گلی سے اب قدم اٹھتے نہیں
زندگی، دیوار کے سایے میں ہی کٹ جائے گی

اِس نئے موسم میں ہم دونوں ہوا کی زد میں ہیں
زندگی، نیّر! کسی پتھر سے پھر ٹکرائے گی

میں بھول چکا ہوں تمہیں یہ مجھ سے گلہ ہے
تم نے بھی تو حالات سے سمجھوتہ کیا ہے

آئینۂ دل ہاتھوں سے جب چھوٹ چکا ہے
تجدیدِ ملاقات سے اب فائدہ کیا ہے

شبنم کے مقدر کی طرح دامنِ گل میں
تم نے مجھے با دیدۂ نم چھوڑ دیا ہے

ماضی کی پگھلتی ہوئی دہلیز پہ آکر
یہ کون ہے جو دیر سے خاموش کھڑا ہے

اُترا ہوا چہرہ یہ پریشان سی زلفیں
اے دوست! یہ سب ترکِ تعلق کا صلہ ہے

دُھندلی سی ہی تصویر لگا ہوں میں کسی کی
کیوں آئینہ ہاتھوں سے مرے چھوٹ رہا ہے

جب زیست ہی رِستا ہوا ناسور ہے نیّر
اب کس سے کہوں دل کا ہر اک زخم ہرا ہے

اِس بھری بزم میں تنہا ہوں ہمیشہ کی طرح
آپ کے ہوتے اکیلا ہوں ہمیشہ کی طرح

اپنے شاداب گلستاں سے چلے بھی آؤ
اُسی ویرانے میں رہتا ہوں ہمیشہ کی طرح

فصلِ گُل آتی گئی کتنے ہی موسم بدلے
تم کو میں ڈھونڈتا پھرتا ہوں ہمیشہ کی طرح

یہ سمجھ کر کہ کوئی راہ میں بیٹھا ہو گا
ایک ہی رہ سے گزرتا ہوں ہمیشہ کی طرح

اپنی کھوئی ہوئی آواز کے پیچھے پیچھے
ایک مدت سے میں چلتا ہوں ہمیشہ کی طرح

کتنے لوگوں نے یہاں بھر لیے دامن اپنے
میں تہی دست ہی لوٹا ہوں ہمیشہ کی طرح

کیا ملا رشتۂ دل توڑ کے مجھ کو نیّر!
اب بھی بے چین سا رہتا ہوں ہمیشہ کی طرح

جیسے بھی کچھ ہو لوگ ہیں جانتے تو ہیں
آوارگانِ شہر کو پہچانتے تو ہیں

اتنا تو چشمِ نم! ہمیں بدنام بھی نہ کر
دل کا کہا کبھی کبھی ہم مانتے تو ہیں

یہ اور بات ہے کہ تجھے پا نہیں سکے
ہم کائنات تیرے لیے چھانتے تو ہیں

آپ اپنے فیصلے پہ ذرا غور کیجئے
آدابِ بزم ویسے بھی ہم جانتے تو ہیں

تم نے اگرچہ بزم سے ہم کو اٹھا دیا
کچھ لوگ پھر بھی شہر میں پہچانتے تو ہیں

کیوں میرا نام سنتے ہی انجان ہو گئے
نیر کو آپ اچھی طرح جانتے تو ہیں

کم سخن میں ہوں آپ کم آمیز
زندگی پھر بھی ہے تبسم ریز

لب پہ ہے طنز بھی تبسم بھی
ہر ادا اُن کی مصلحت آمیز

بھیگی پلکوں سے خوں ٹپکنے لگا
دامنِ دل جو ہو گیا خوں ریز

دل کی ویرانیوں کا کیا ہوگا
زندگی تُو بھی ہے نشاط انگیز

رُک گئے قافلے بہاروں کے
کس کی آہیں ہیں اتنی درد انگیز

لڑکھڑاتے ہیں زندگی کے قدم
نشۂ زندگی ہے کتنا تیز

اب بھی دل میں ہے تازگی نیّر
اُن کی یادیں ہیں کتنی دل آویز

جب تمہارے خط کو میں نے نذرِ آتش کر دیا
ایک اک لفظِ وفا نے دُور تک پیچھا کیا

آخری تحریر تھی اُن کی یہ میں نے کیا کیا
خود بھی تنہا ہو گیا اُن کو بھی تنہا کر دیا

اپنی صورت بھی نہ میں پہچان پایا دوستو
وقت کا میں بھی ہوں آئینہ مگر ٹوٹا ہوا

تم نے یہ کیا کر دیا تنہائیاں بھی چھین لیں
کتنے برسوں کا سہارا تھا مگر وہ بھی گیا

رُت بدلتے ہی تمہیں آسودگی تو مل گئی
تم نے لیکن یہ نہ سوچا مجھ کو آخر کیا ملا

کیا بتاؤں کتنی مشکل سے بھلایا تھا تمھیں
تم ملے تو دل کا ہر اک زخم پھر تازہ ہوا

کتنے ہی موسم یہاں آتے رہے نیّر مگر
ہے خیالِ دوست پھولوں کی طرح مہکا ہوا

تمام عمر ہنسی کے لیے ترستے ہیں
تمہارے شہر میں ایسے بھی لوگ بستے ہیں

ہزار دور سہی منزلِ وفا لیکن
خلوصِ عشق سلامت ہزار رستے ہیں

کبھی تو اپنے بھی دامن کا جائزہ لیجے
ہمیشہ آپ مرے آنسوؤں پہ ہنستے ہیں

نگاہِ لطف کے لمحے وہ التفات کے دن
کبھی کبھی مری تنہائیوں کو ڈستے ہیں

ہمیشہ شعلہ و شبنم کی آرزو کیسی
ہماری پلکوں سے کچھ پھول بھی برستے ہیں

حیات بیچنے والوں کے فیض سے تیرؔ
متاعِ زیست کے دام آج تک بھی سستے ہیں

رام لچھمن کی زمیں پر ایک الجھن اور ہے
ساری لنکا جل چکی ہے ایک راون اور ہے

زندگی ارزاں بھی خوش رنگ چہروں پر نہ جا
مانگ میں جس کی لہو ہے وہ سہاگن اور ہے

اشکِ خوں آنکھوں سے بہہ جانے کا میں قائل نہیں
جس میں ساری زندگی بھیگے وہ ساون اور ہے

کتنے برسوں بعد اپنے گھر بلائے ہو مگر
جب میں پہلی بار آیا تھا وہ آنگن اور ہے

اتنے سارے چہرے پڑھ لینا تو کچھ مشکل نہیں
عکسِ رد دے دوست جس میں ہے وہ درپن اور ہے

ایک پل رکنے نہ پاؤں گا میں دورانِ سفر
میں تو اک شاہین ہوں میرا نشیمن اور ہے

کون دے گا مجھ کو تیرا بھیگی پلکوں کا خراج
میرے آنسو جذب جس میں ہیں وہ دامن اور ہے